ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ

دیوانِ لطفؔ

(مرزا علی لطفؔ)

اشاعت : اپریل ۱۹۸۳ء

طباعت : دائرہ الکٹرک پریس
چھتا بازار حیدرآباد

قیمت : پچیس ۲۵ روپے

تعداد : پانچ سو

ناشر : ادارۂ شعر و حکمت
۸۲۵ - ۲ - ۱۱
ریڈ ہلز، حیدرآباد

ملنے کے پتے :-

۱- مصنف :- مکان نمبر ۲/۳۲-۱۰-۹ - ۵، حیدرگوڑہ
حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

۲- الیاس ٹریڈرس، شاہ علی بنڈہ روڈ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

۳- حسامی بک ڈپو - مچھلی کمان، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

۴- مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی، بمبئی، علی گڈھ

انتساب

شفیق و محترم استاد ڈاکٹر مغنی تبسم کے نام
جن کی رہنمائی میں میں نے اپنی
علمی، ادبی زندگی کی کئی منزلیں طے کیں۔

مرزا اکبر علی بیگ

ترتیب

دیوانِ لطف (قلمی) مخزونہ کتب خانہ جامعۂ عثمانیہ، حیدرآباد
کے ایک صفحہ کا عکس

تعارف

مرزا علی لطف، میر اور سودا کے ہم عصر تھے، اُردو ادب کی تاریخ میں وہ اپنے "تذکرہ گلشنِ ہند" کی وجہ سے مشہور رہیں۔ ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر لطف نے علی ابراہیم خاں کے تذکرہ "گلزارِ ابراہیم" کو جو فارسی میں تھا "گلشنِ ہند" کے نام سے اُردو میں منتقل کیا تھا۔ مولوی عبدالحق نے ایک مقدمہ کے ساتھ یہ تذکرہ انجمن ترقی اُردو سے شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ اِس سے قبل لطف پر ایک مبسوط کتاب "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" شایع کر چکے ہیں جو اُن کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے پر مبنی تھی۔ "دیوانِ لطف" کی ترتیب و تدوین ڈاکٹر اکبر صاحب کے تحقیقی کام کا گویا ایک تسلسل ہے۔ لطف کا کلام جو اپنی کیفیت اور کمیت کے قطعِ نظر، تاریخِ زبان کے نقطۂ نظر سے اشاعت کا مستحق تھا، ابھی تک مخطوطات میں محفوظ تھا۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے متعدد مخطوطوں سے اُن کے چیدہ، چیدہ کلام کو یکجا کیا ہے اور مختلف متون کے باہمی مقابلے کے بعد تدوینِ متن کے جدید اصولوں کی روشنی میں "دیوانِ لطف" کی ترتیب و تدوین کی ہے، اور ضروری تعارف کے ساتھ اسے شایع کر رہے ہیں۔

کلامِ تاباں کا بیشتر حصہ، خود شاعر نے اپنے تذکرہ گلشنِ ہند میں محفوظ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر اکبر صاحب نے قلمی دیوانِ تاباں (مخزونہ عثمانیہ یونیورسٹی) کے علاوہ تذکرے کے دو مخطوطوں کی مدد سے جو کتب خانہ سالار جنگ اور جرمنی کی اسٹاٹ سی بیلیو تھک لائبریری کی ملکیت ہیں، تاباں کا کلام جمع کیا ہے اور مختلف تذکروں میں جو مخطوطات کی شکل میں ہیں، تاباں کے جو منتشر اور چیدہ اشعار ملتے ہیں، انھیں بھی چھان بین کر کے یکجا کیا ہے اور پھر تعینِ متن کے لیے مختلف نسخوں کے اشعار کا باہمی مقابلہ کر کے، ان کا متن تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ منتخبہ یا مدونہ متن کے ساتھ، دوسرے مخطوطوں کے اختلافات بھی درج کر دیے گیے ہیں۔ اس طرح یہ مرتبہ دیوان، متنی تنقید کے نقطۂ نظر سے ایک وقیع علمی کاوش کی صورت میں سامنے آیا ہے۔

ڈاکٹر اکبر علی بیگ صاحب کا ایک وصف یہ ہے کہ جب وہ کوئی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں، تو اسے انہماک، جاں فشانی اور سلیقے کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پیشِ نظر تحقیقی کاوش بھی متذکرہ خصوصیات کی آئینہ دار ہے۔

تاباں کی زبان پر میر اور سودا کی زبان کے مقابلے میں، قدامت کی چھاپ نمایاں ہے۔ بیسیوں الفاظ ان کے کلام میں ایسے ملتے ہیں جو میر، سودا، یا درد کے ذخیرۂ الفاظ میں نہیں ملتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے نصف دوم میں، قدیم اردو، مرزا مظہر کی تحریک کے زیرِ اثر، تدریجی طور پر ایک نیا روپ اختیار کر رہی تھی۔ تبدیلی کا یہ عمل جاری تھا، جو مختلف شعرا کے ہاں مختلف انداز اور مختلف رویوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔ مظہر کے معاصرین نے اصلاحِ زبان کے بارے میں اُن کے اصولوں کو یک لخت قبول نہیں کیا تھا۔ سودا نے اپنے مشہور قطعہ میں مظہر کی فارسی زدہ اردو کا مذاق

اڑایا تھا۔ اس لیے لطف کے ذخیرۂ الفاظ میں قدیم عنصر نمایاں ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

لطف کی زبان کے اس پہلو نے 'تدوین متن کے سلسلے میں' مرتب کے کام کو دشوار بنا دیا تھا۔ قدیم متن کی تدوین کے دوران' جب تک کسی شعر میں کسی پیچیدہ اور الجھے ہوئے لفظ کی صوتی شکل' اور اس کے معنی' پوری طرح متعین نہ ہو جائیں' شعر قابلِ فہم نہیں بنتا۔ متنی نقاد کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قدیم متن کو عہدِ حاضر کے قاری کے لیے' قابلِ قرأت اور قابلِ فہم بنا کر پیش کرے۔ اگر نقادؔ متن کے کسی الجھے ہوئے حصے کو حل کیے بغیر' اسی حالت میں درج کر کے گزر جاتا ہے' تو وہ مصنف کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے' اور قاری کو دھوکا دیتا ہے۔ یہ طریقۂ کار تدوین متن کی ذمہ داری کے یکسر منافی ہے۔ قدیم اور دشوار متن میں بعض ایسے مقامات یقیناً درپیش ہو سکتے ہیں' جو متنی محقق کی پوری سعی کے باوجود' کھل نہ سکے ہوں لیکن ایسی صورت میں تحقیقی دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے مقامات کی نشاندہی کر دی جائے' اور اس امر کی وضاحت بھی کہ متن کے متذکرہ حصے کو کھولنے میں کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ اس قسم کا اعتراف کسی تحقیقی کوشش کو باوقعت اور قابلِ اعتماد بنا دیتا ہے۔

کلامِ لطف کے مرتب کو بھی' لطف کی زبان میں قدیم عنصر کی موجودگی کے سبب' ایسے مقامات سے گزرنا پڑا ہے' اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انھوں نے اپنی تحقیقی ذمہ داری کو کامیابی کے ساتھ نباہنے کی کوشش کی ہے۔ قدیم زبان کے متن میں اکثر الفاظ' صوتی سادہ کاری کے عمل کے زیرِ اثر' طرح طرح کے روپ بدل کر ایسی شکلوں میں پیش ہوتے ہیں' کہ اُن کی شناخت' یا لغات میں ان کی تلاش ممکن نہیں ہوتی۔ لطف کی زبان میں بھی ایسا عنصر

موجود ہے۔ ڈاکٹر اکبر صاحب نے تگ ودو کر کے ایسے الفاظ کو قدیم زبان کے ماہرین کی مدد سے کھولنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود جو الفاظ حل نہیں ہوسکے، انہوں نے دیانت داری کے ساتھ اُن کی نشان دہی کردی ہے۔ علمی مسائل میں تحقیق و تفحص کی یہ لگن قابلِ قدر ہے۔

کلام لطف کی پیش نظر ترتیب و تدوین، متنی تحقیق و تنقید کا کامیاب نمونہ ہے۔ میں ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کو اِس وقیع علمی کاوش کے لیے مبارکباد دیتا ہوں۔

ڈاکٹر غلام عمر خاں
پروفیسر شعبہ اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی
حیدرآباد۔ اے پی

۹/ اپریل ۱۹۸۳ء

"سمن زار" ۱۶-۴-۲۴
اکبر باغ ۔ حیدرآباد

مقدمہ

مرزا علی لطف کا شمار اردو کے اولین تذکرہ نگاروں میں ہوتا ہے لطف سے قبل اُردو شاعروں کے بہت سے تذکرے مرتب ہوئے ہیں لیکن یہ سب فارسی زبان میں ہیں لطف پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو میں تذکرہ نگاری کی بنیاد ڈالی ۔ ان کا تذکرہ "گلشن ہند" کہنے کو فارسی تذکرہ "گلزار ابراہیم" کا ترجمہ ہے لیکن اس میں لطف نے اتنے اضافے کئے ہیں کہ ہم بغیر کسی تردد کے اس کو لطف کی تصنیف قرار دے سکتے ہیں۔

عام طور پر لطف کا شمار فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مصنفین میں کیا جاتا ہے لیکن اس کالج سے لطف کا براہ راست تعلق نہیں رہا محض ایک بار وہ شیر علی افسوس کے توسط سے ڈاکٹر جان گلکرسٹ پروفیسر ہندستانی فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے متعارف ہوئے اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ان سے فرمائش کی کہ وہ علی ابراہیم خاں خلیل کے فارسی تذکرہ "گلزار ابراہیم" کا اردو میں ترجمہ کریں چنانچہ ان کی ایما پر لطف نے اس تذکرہ کو اس زمانے کی سلیس اور سادہ زبان میں لکھ کر گلکرسٹ کی خدمت میں سنہ ۱۸۰۱ء میں پیش کیا جسے گلکرسٹ نے بے حد پسند کیا لیکن نامعلوم وجوہ سے یہ تذکرہ شائع نہیں ہوا۔ حسنِ اتفاق سے اس کا ایک نسخہ رودِ موسیٰ کے سیلاب میں بہتا ہوا مولوی غلام محمد مددگار کیبنٹ کونسل دولتِ آصفیہ کے ہاتھ لگا جس کو انہوں نے شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے حوالے کیا جو ان دنوں حیدرآباد دکن میں مقیم تھے ۔ مولانا شبلی نے بعد تصحیح و تحشیہ اس کو انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع کرنے کا قصد کیا لیکن انجمن چند اسباب کی بنا پر اس کو نہ چھاپ سکی ۔ بعد میں مولوی عبدالحق کے ایک عالمانہ مقدمے کے ساتھ عبداللہ خاں نے اس کو رفاہ عام پریس لاہور سے سنہ ۱۹۰۶ء میں شائع کیا پھر سنہ ۱۹۳۴ء میں انجمن ترقی اردو علی گڈھ

نے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے مقدمے کے ساتھ اس تذکرہ کا ایک اور ایڈیشن شائع کیا اس میں گلزارِ ابراہیم کے وہ حصے شامل کر دئے گئے ہیں جن کا ترجمہ لطف نے نہیں کیا تھا۔

لطف نے تذکرہ گلشن ہند میں اردو کے ۶۹ شعرا کے حالات زندگی ان کے نمونۂ کلام کے ساتھ دئے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے شعرا کے حالاتِ زندگی میں تو کوئی ترمیم نہیں کی مگر لطف کے دئے ہوئے نمونۂ کلام میں تحریف کر دی اور صفحے کے صفحے حذف کر دئے۔ ڈاکٹر زور نے بھی اسی طرح مولوی عبدالحق کی من وعن تقلید کی ہے۔ راقم الحروف نے گلشن ہند کے اصل نسخوں سے جب مطبوعہ نسخوں کا موازنہ کیا تو اس میں کافی فرق پایا۔

لطف ایک اچھے نثر نگار ہونے کے علاوہ ایک پُرگو شاعر بھی تھے۔ عام طور پر ادبی حلقوں میں لطف کو ایک تذکرہ نگار کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا ہے جبکہ وہ میر و سودا کے عہد کے ایک خوش گو اور اعلیٰ درجے کے شاعر بھی تھے۔ اب تک لطف کی شاعرانہ حیثیت کو کسی نے متعین کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی ان کا دیوان ہنوز منظر عام پر آیا ہے۔ "دیوان لطف" کا صرف ایک نسخہ دستیاب ہوتا ہے جو کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہے اس کے مطالعے سے بہ حیثیت شاعر لطف کا مقام متعین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

اردو کے تذکروں اور تواریخ میں لطف کے بہت کم حالات زندگی دستیاب ہوتے ہیں۔ لطف کی حیات پر سب سے پہلی کتاب ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی ہے جو "حیات لطف" کے نام سے ۱۹۶۳ء میں مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی۔

لطف نے اپنے تذکرے "گلشن ہند" میں اپنے نام کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے۔

"لطف تخلص[۱]، مرزا علی نام۔ راقم ہے اس چند اوراق پریشاں کا۔" اس بیان کے پیش نظر لطف کے نام کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن بعض تذکروں میں مرزا علی لطف کی بجائے کچھ اور نام لکھے گئے ہیں۔ "تذکرہ طبقات الشعراء" میں جو "گلشن ہند"

---

[۱] لطف۔ مرزا علی گلشن ہند (مرتبہ شبلی نعمانی) (لاہور ۱۹۰۶ء) ص ۱۴۶

سے ستائیس برس پہلے لکھا گیا ہے لطف کا نام مرزا علی ہی لکھا گیا ہے اس کے علاوہ "مجمع الانتخاب" "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" "خطبات گارساں دتاسی" اور "بیاض سخن" میں بھی یہی نام بتایا گیا ہے "گلستان بے خزاں" میں لطف کا نام مرزا عالی لکھا ہے[1] لیکن فہرست میں مرزا علی ہی چھپا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے۔ نمونۂ کلام لطف کا ہی دیا گیا ہے۔

"عمدۂ منتخبہ" میں مرزا علی لطف کا ذکر دوبارہ اس طرح آیا ہے گویا یہ دو الگ اشخاص ہیں۔ صفحہ ۵۵۰ پر لطف کے جو حالات لکھے ہیں وہ مرزا علی لطف کے ہیں اور نمونۂ کلام بھی انھیں کا ہے[2]۔ مثلاً یہ شعر:۔

روشن ضمیر کیوں کہ نہ ہوں دل کے داغ سے

خورشید کو ہے کسب ضیا اس چراغ سے

یہ شعر "دیوان لطف" میں موجود ہے[3]۔ اس کے بعد ایک اور جگہ لطف کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ "لطف تخلص مرزا علی ساکن لکھنؤ شاگرد شاہ ملول[4]" یہاں بھی نمونۂ کلام مرزا علی لطف کا دیا گیا ہے مثلاً یہ شعر دیوان میں صفحہ ۱۰ پر ملتا ہے[5]۔

آپ تو بات میں بگڑتے ہیں واہ کیا منہ سے پھول جھڑتے ہیں

صاحب تذکرہ کو ظاہر ہے کہ مغالطہ ہوا جس کا سبب لطف کا شاگرد ملول بتایا جاتا ہے پہلے لطف سے وہ اس طرح واقف ہیں کہ وہ دہلی میں پیدا ہوئے اور چند روز ان کا قیام عظیم آباد میں رہا۔ دوسری بار لطف کو شاگرد ملول اور لکھنؤ کے ساکن کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ کسی وجہ سے انھیں دھوکہ ہوا کہ یہ دو مختلف لطف ہیں۔ گارساں دتاسی نے ان کی غلط

---

[1] باطن قطب الدین گلستان بے خزاں (لکھنؤ ۱۸۷۵ء) ص ۲۰۲

[2] سرور نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر عمدۂ منتخبہ (تذکرۂ سرور) (مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی) (دہلی ۱۹۶۱ء) ص ۵۵۰

[3] لطف مرزا علی دیوان لطف قلمی مخزونہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ۔ ص ۱۴ ب

[4] عمدۂ منتخبہ ص ۵۵۱

[5] دیوان لطف ص ۱۰

فہمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

" سرور انھیں لکھنؤ کے مرزا علی لطف سے مختلف شخص سمجھتے ہیں جو طپش کے شاگرد اور " گلشن ہند " کے مصنف ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں شخصیتیں ایک ہیں[1] "

سرور کا لکھنؤ کے لطف کو دلی کے لطف سے مختلف سمجھنا تعجب خیز بھی ہے جبکہ انھیں کے ہم عصر تذکرہ نگار شاہ کمال لطف سے لکھنؤ میں مل چکے ہیں اور ۱۸۰۴ء میں اپنا تذکرہ مکمل کیا تھا جس میں لطف کے حالات بھی لکھے ہیں۔ انہوں نے لطف کو شاگرد مرزا بتایا ہے[2]۔ ایسی ہی غلط فہمی تذکرہ خوش معرکۂ زیبا کے مصنف سعادت خاں ناصر کو ہوئی ہے۔ لطف کے بارے میں اس طرح کی غلط فہمیوں کا سبب ان کی شاگردی کے بارے میں اختلافات بھی ہیں۔ کوئی انھیں میر کا شاگرد کوئی سودا کا اور کوئی طپش کا شاگرد بتاتا ہے جبکہ لطف نے صاف لفظوں میں یہ لکھا ہے کہ وہ کسی کے شاگرد نہیں۔

جہاں تک میر اور سودا کی شاگردی کا تعلق ہے بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ لطف اس سے انکار کریں۔ میر یا سودا کا شاگرد کہلانا ان کے لئے باعث افتخار ہو سکتا تھا اس لئے قیاس اغلب ہے کہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر انہوں نے خود کو میر یا سودا کا شاگرد ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔

شیفتہ نے لطف کو میر کا شاگرد بتایا ہے وہ چنانچہ وہ لکھتے ہیں " نسبت شاگردی بہ میر تقی داشتہ[3] "

گارساں دتاسی بھی شیفتہ کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔

انہوں نے لکھا ہے :-

" ہندوستان کے روحانی ادیب مرزا علی لطف گرگان میں استرآباد کے باشندے

---

[1] ۔ گارساں دتاسی۔ ہستوار دے لالترے تیوری ہندوی ایت ہندوستانی (فرانسیسی) (پیرس ۱۸۷۰ء) ص ۱۳۶

[2] ۔ شاہ کمال تذکرہ جمع الانتخاب (قلمی مخزونہ سالار جنگ لائبریری ص ۲۷۹ ب)

[3] ۔ شیفتہ گلشن بےخار لکھنؤ ۱۸۳۵ء ص ۱۶۷

کاظم بیگ خاں کے فرزند . . . نے ہندوستانی (اُردو) زبان اختیار کی اور میر تقی کی شاگردی کی[1]۔

محمد حسین خاں[2] اور احمد حسین سحر[3] بھی شیفتہ اور گارساں دتاسی کی طرح لطف کو میر کا شاگرد ہی لکھتے ہیں۔

ایک بات جو قطعی طور سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ لطف کو میر سے تلمذ حاصل نہیں تھا۔ لطف نے جب اپنا تذکرہ لکھا میر زندہ تھے اور لطف نے اپنے تذکرے میں میر کا جو حال لکھا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لطف میر کے قریب رہ چکے تھے اور حیدرآباد آنے کے بعد بھی ان کے حالات سے باخبر تھے اس امکان کے پیش نظر کہ ان کا تذکرہ میر کی نظر سے گذرے گا وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتے تھے اور اگر وہ میر کے شاگرد ہوتے تو اس کا اظہار ضرور کرتے۔

تذکرہ نگاروں کی اکثریت نے انھیں سودا کا شاگرد قرار دیا ہے۔ ان میں خوب چند ذکا اور شاہ کمال بھی شامل ہیں جن کے بیانات کو آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ خوب چند ذکا نے لطف کے حالات بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے "مرزا علی لطف وے شخص مغل زاست، ساکن بلدۂ لکھنؤ از مرزا محمد رفیع سودا اصلاح یافتہ[4]"

شاہ کمال لکھنؤ میں لطف سے مل چکے تھے اور حیدرآباد میں بھی لطف کے ساتھ رہے، وہ لکھتے ہیں۔

"مرزا علی خاں لطف شاگرد رشید مرزا صاحب قبلہ[5]" ان کے علاوہ قاسم[6]

---

[1] تاریخ ہندوستانی اور ہندوستانی ادب (فرانسیسی) (فرانس ۱۸۷۰ء) جلد دوم ص ۲۳۲

[2] تذکرہ ریاض الفردوس (ترتیب حواشی مرتضیٰ حسین فاضل) لکھنؤ ۱۸۶۷ء) ص ۱۲۳

[3] بہارِ بے خزاں (بہ تصحیح ڈاکٹر منعم احمد) (دھلی ۱۹۶۸ء) ص ۸۳ [4] عیار الشعرا (قلمی مخزونہ برٹش میوزیم ص ۱۳۷ الف۔ [5] مجمع الانتخاب (قلمی مخزونہ سالار جنگ لائبریری) ص ۲۷۹ (ب)

[6] مجموعۂ نغز ص ۱۴۸۔

ناصرؔ[1]، نساخؔ[2]، حسرتؔ موہانی[3] وغیرہ نے بھی انھیں سودا کا شاگرد لکھا ہے عشقیؔ نے سوداؔ کے شاگرد ہونے کا ذکر اس طرح سے کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"ازیں جہت خود را بہ شاگردی مرزا اہتمام کرد"[4]

گویا لطفؔ حقیقت میں سوداؔ کے شاگرد نہیں تھے لیکن خود کو شاگرد ظاہر کرتے تھے۔
عشقی کے اس بیان سے کسی قدر یہ معمہ حل ہوتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ لطفؔ تو حقیقت میں سوداؔ کے شاگرد تھے اور یہ بات عام طور پر مشہور تھی۔ پھر کچھ بات ایسی ہوئی کہ انہوں نے خود کو کسی کا شاگرد ظاہر کرنا پسند نہیں کیا جیسا کہ قاضی عبدالودود کا خیال ہے۔

"اس کا امکان ہے کہ لطفؔ نے کسی زمانے میں مشہور کر رکھا ہو کہ انہوں نے سوداؔ سے اصلاح لی تھی لیکن بعد کو اس امر واقعی کا اعلان کر دیا ہو کہ کسی کے شاگرد نہیں"[5]

لطفؔ نے جب تذکرہ لکھا سودا کا انتقال ہوچکا تھا اس وقت لطفؔ نے شاگردی سے انکار کیا تو کم از کم سوداؔ کے سامنے جواب دہ ہونے کا انھیں خوف نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم بھی اسی خیال کے حامی ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب میں سودا کے ۳۶ شاگردوں کی طویل فہرست دی ہے لطفؔ کے حالات زندگی تحریر کرتے ہوئے لطفؔ کے تلمذ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

"امکان یہ ہے کہ مرزا علی لطفؔ کو سودا سے تلمذ تھا لیکن بعد میں ان کی شاگردی سے وہ منکر ہوگئے"[6]

ایک قیاس یہ ہوسکتا ہے کہ لطفؔ حقیقت میں سوداؔ کے شاگرد نہ رہے ہوں سوداؔ

---

[1] ۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا ص ۳۶

[2] ۔ سخن شعرا ص ۵-۴

[3] ۔ اردوئے معلیٰ (علی گڈھ اگست ۱۹۱۰ء) ص ۳

[4] ۔ تذکرہ عشقی (مرتبہ کلیم الدین احمد) پٹنہ ۲۳ ۱۹ء) ص ۱۷۷

[5] ۔ عبدالحق بحیثیت محقق معاصر سہ ماہی (پٹنہ نومبر ۱۹۵۹ء) ص ۳۱

[6] ۔ مرزا محمد رفیع سودا (دہلی ۱۹۶۶ء) ص ۵۹۱

کا انتقال ہو چکا تھا اور انہوں نے مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے خود کو مستند شاعر ظاہر کرنے کی غرض سے یہ مشہور کر دیا ہو کہ سودا سے نسبت تلمذ حاصل رہی ہے اور بعد میں تذکرہ لکھتے وقت جو حقیقت تھی اسے ظاہر کر دیا ہو۔

لطف ملولؔ کے شاگرد یقیناً نہیں تھے ایسا ہوتا تو وہ تذکرے میں اس کا اظہار ضرور کرتے۔ شاہ ملول فارسی کے شاعر تھے اردو میں بھی وہ شعر کہا کرتے تھے۔ پہلے ان کا تخلص ملول تھا بعد میں انہوں نے الہام تخلص اختیار کیا۔ لطف نے الہام ہی کے تخلص کے تحت ان کے حالات اپنے تذکرے میں درج کئے ہیں۔ یہ غلط فہمی کہ لطف ملولؔ کے شاگرد تھے غالباً اس بناء پر ہوئی کہ لکھنؤ میں ان کی نشست و برخاست زیادہ تر ملولؔ کے ہاں رہتی تھی اور جیسا کہ لطف نے لکھا ہے کہ بیشتر اہل لکھنو کو شاگردی کے سوائے ان سے اعتقاد تمام ہے۔ اس اعتقاد کی بناء پر لطف کو بھی ملولؔ کا شاگرد سمجھ لیا گیا ہو۔

لطف کے آباء اجداد کا تعلق ایران سے تھا ان کے والد کاظم بیگ خاں استر آباد کے رہنے والے تھے اور نادر شاہ کی افواج کے ہمراہ ہندوستان آئے تھے۔ نادر شاہ ہندوستان سے ایران لوٹے تو مرزا کاظم بیگ یہیں رہ پڑے۔ ابو المنصور خاں صفدر جنگ (جن کے نام کی ایرپورٹ دہلی میں موجود ہے) سے ان کے تعلقات ایران ہی سے تھے۔ اُن ہی کی وساطت سے دربار شاہی میں باریاب ہوئے۔ اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے۔ مرزا کاظم بیگ خاں فارسی کے ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ وہ ہجری تخلص کرتے تھے۔

لطف کا سنہ ولادت کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا خود لطف نے اپنے تذکرے یا کسی تصنیف میں اپنی تاریخ پیدائش نہیں لکھی محض قیاس آرائی کی بناء پر سنہ ولادت کا تعین کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا چنانچہ ڈاکٹر جاوید نہال نے لکھا ہے کہ

"مرزا علی لطف کی پیدائش دار السلطنت دہلی میں غالباً ۱۷۶۰ء اور ۱۷۶۲ء کے درمیان ہوئی کیونکہ جب وقت کلکتے آئے ان کی عمر لگ بھگ چالیس سال کی تھی۔[۱]"

---

[۱] جاوید نہال ڈاکٹر انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب (کلکتہ) ص ۲۲۲

یہ قیاس آرائی ہی ہے کوئی ایسا ثبوت نہیں پیش کیا ہے جس کی بناء پر یہ تسلیم کیا جائے کہ جس وقت وہ کلکتہ آئے ان کی عمر لگ بھگ چالیس برس کی تھی ۔ ڈاکٹر جاوید نہال کی طرح قاضی عبدالودود نے بھی قیاس آرائی سے کام لیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں:۔

" پیدائش کہیں کی ہو "صغر سن" سے مقیم لکھنؤ ضرور تھے ۔ قیاس ہے کہ ۱۱۷۱ھ اور ۱۱۷۵ھ کے درمیان پیدا ہوئے ہوں گے "[1]

ان قیاس آرائیوں کے سوا تلاش و تحقیق کے باوجود راقم الحروف کو کوئی ایسا مواد دستیاب نہیں ہو سکا جس سے لطف کی تاریخ پیدائش کا قطعی طور پر تعین ہو سکے اکثر تذکرہ نگاروں نے دہلی کو لطف کا مولد قرار دیا ہے ۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ لطف نے فارسی کی تحصیل اپنے والد مرزا کاظم بیگ خاں ہجری سے کی ۔ فارسی کلام پر والد ہی سے اصلاح لی ۔ اس زمانے میں دہلی شعر و شاعری کا مرکز بنا ہوا تھا ۔ یہ کہا جائے تو بےجا نہ ہوگا کہ یہ اردو شاعری کا زرین عہد تھا ۔ دبستان دہلی کے مشہور شعرا میر، درد، سودا، سوز کے اشعار ہر خاص و عام کی زبان پر تھے، مشاعرے آئے دن منعقد کیے جاتے تھے، گمان اغلب ہے کہ لطف نے اپنی نوجوانی میں دہلی کے ان مشاعروں میں شرکت کی ہوگی ۔ اس زمانے میں دہلی کے حالات بہت خراب ہو گئے تھے ۔ ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی تھی ۔ سلاطین مغلیہ کمزور ہو چکے تھے ۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی کی سلطنت کے بارے میں یہ ضرب المثل ہر خاص و عام کی زبان پر تھی " سلطنتِ شاہ عالم از دلّی تا پالم"۔ جب بادشاہ کمزور ہو جاتا ہے تو امراء و اعلیٰ عہدیدار سازشوں میں مصروف ہو جاتے ہیں ۔ یہی حال دہلی کے امراء و اعلیٰ عہدیداروں کا ہوا ۔ بادشاہ امراء اور اعلیٰ عہدیداروں کی ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انگریز اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے ۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں ہر خاص و عام پریشان تھا ۔ ظاہر ہے کہ لطف بھی ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ غالباً ان ہی اسباب کی بناء پر لطف دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور لکھنؤ چلے آئے ۔

---

[1] قاضی عبدالودود "عبدالحق بہ حیثیت محقق" معاصر سہ ماہی (پٹنہ نومبر ۱۹۵۹ء) ص ۳۱

نواب آصف الدولہ نواب صفدر جنگ کے پوتے تھے۔ قدیم خاندانی مراسم کی بناء پر لطف کو اپنے پاس بلوالیا اور اپنے زمرۂ ملازمین میں داخل کرکے گذر بسر کے لئے کچھ مشاہرہ مقرر کردیا۔ لکھنؤ میں لطف کو آرام و اطمینان کی زندگی میسر ہوئی۔ نواب آصف الدولہ کے انتقال کے بعد لطف کی ملازمت کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا جس کی وجہ سے وہ لکھنو چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ لکھنؤ سے روانہ ہونے کے بعد لطف نے عظیم آباد میں بھی قیام کیا۔ (عظیم آباد کا موجودہ نام "پٹنہ" ہے جو ریاست بہار کا پائے تخت ہے)۔ لطف عظیم آباد سے مرشد آباد پہونچے مرشد آباد ان دنوں علم وادب کا گہوارہ بن چکا تھا۔ شیر علی افسوس کلکتہ جانے سے قبل مرشد آباد میں وارد ہوئے تھے وہ لطف کے گہرے دوست تھے چنانچہ ان کا قیام مرشد آباد میں لطف کے ہاں رہا۔ شیر علی افسوس کا تقرر فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں منشی کی حیثیت سے ہوا تھا۔ رجوع ملازمت سے قبل انہوں نے لطف کے ہاں قیام کیا۔ شیر علی افسوس کے کلکتہ روانہ ہونے کے کچھ عرصہ بعد لطف بھی افسوس کی دعوت پر مرشد آباد سے کلکتہ پہونچے۔ افسوس نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ سے لطف کا تعارف کروایا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر لطف نے ۱۸۰۱ء میں تذکرہ "گلشن ہند" لکھا۔ لطف کلکتہ محض افسوس کی دعوت پر گئے تھے ان کا ارادہ وہاں طویل قیام کا نہ تھا۔ وہ چند روز کلکتہ کی سیر کر کے حیدرآباد دکن جانا چاہتے تھے لیکن جان گلکرسٹ نے اپنی فرمائش کو ایسے اخلاق و خوبی سے بیان کہ لطف انکار نہ کرسکے اور گلشن ہند کی تدوین میں مصروف ہوئے۔

ڈاکٹر جاوید نہال نے لکھا ہے کہ" لطف کو کالج کی ملازمت باضابطہ نہیں مل سکی تھی"[1]۔ حقیقت یہ ہے کہ لطف نے ملازمت کے حصول کی کوشش ہی نہیں کی اگر وہ چاہتے تو ہمہ وقتی منشی کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوسکتا تھا کیونکہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ ان کی قابلیت سے متاثر تھے اور شیر علی افسوس جو ان کے دوست اور بہی خواہ تھے انگریز حکام اور کالج کے عہدیداروں سے اچھے مراسم رکھتے تھے۔

---

[1] ۔ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب (کلکتہ) ص ۳۲۸

لطف نے بہت ہی قلیل عرصہ کے لئے کلکتہ میں قیام کیا۔ تذکرۂ گلشن ہند کی تالیف (۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۱ء) کے بعد وہ حیدرآباد دکن روانہ ہو گئے۔ لطف حیدرآباد دکن اپنے بھائی علی رضا (رضا) کی ایماء پر آئے تھے رضا نواب ارسطو جاہ بہادر کے دربار سے وابستہ تھے۔ ہو سکتا ہے کہ رضا نے نواب ارسطو جاہ بہادر سے لطف کا ذکر کیا ہو اور انھیں کی رضامندی سے انہوں نے لطف کو حیدرآباد بلایا ہو۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو لطف ممکن تھا کہ کلکتہ ہی میں رہ جاتے۔

لطف کے دو بھائی تھے۔ مرزا علی رضا (رضا) اور حاجی مرزا جان دونوں اپنے زمانے کے مشہور سوز خواں تھے۔ علی رضا شاعر بھی تھے رضا تخلص کرتے تھے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ مجموعہ فصاحت (مرتبہ شاہ علی تجلی)[1] میں ان کا ایک فارسی قصیدہ اور دو اردو قصیدے درج ہیں جو انہوں نے نواب ارسطو جاہ کی مدح میں لکھے تھے۔ لطف کے دوسرے بھائی حاجی مرزا جان کے حالات کا علم نہ ہو سکا غلام حسین جوہر کے بیان سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ چوروں نے انھیں قتل کر دیا تھا[2]۔

حیدرآباد دکن میں اس وقت بڑے بڑے شعرا موجود تھے جن میں مقامی شاعر بھی تھے اور بیرونی شعرا بھی۔ ان میں قابل ذکر حفیظ دہلوی، ماہ لقابائی چندا، صدیق قیس، شیر محمد خاں ایمان، حیدر علی صفا لکھنوی، شاہ کمال، احسن اللہ خاں بیان دہلوی، شاہ علی تجلی، شاہ نصیر وغیرہ ہیں۔ نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی نے لطف کی بڑی سرپرستی کی چار سو روپے ماہوار اور پالکی سے سرفراز کیا۔ درباری شاعر ہونے کے علاوہ لطف نواب ارسطو جاہ کے مصاحب بھی تھے۔ حیدرآباد دکن میں لطف فارغ البال تھے۔ نواب ارسطو جاہ کے انتقال کے بعد میر عالم مدار المہام ہوئے۔ میر عالم نے اپنے پیش رو کی طرح لطف کو بھی اپنے الطاف سے سرفراز کیا۔ لطف کے ہم عصر شاعر و تذکرہ نگار غلام ہمدانی مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لطف کی متانت اور اعلیٰ اخلاق کی تعریف۔ ان الفاظ میں کی ہے۔

---

[1] قلمی مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ ص ۱۲۸

[2] گلزار آصفیہ ص ۴۵۰

"مرزا علی لطف جوان خوش فکر دیدمش طبیعتش، بہ نسبت دیگر شعرائے اینجا متلفتہ دارد"[1]

مرزا علی لطف مذہب امامیہ کے پیرو تھے۔ جہاں جہاں پر موقع ملا ہے لطف نے اپنے شیعہ عقائد کو پیش کرنے کی گنجائش نکال لی ہے۔ لطف کے بارے میں یہ پتا نہیں چلتا کہ آیا وہ متاہل تھے اور ان کی اولاد بھی تھی۔ لطف ایک صاحب دیوان شاعر تھے انکا شمار اپنے زمانے کے اساتذہ فن میں ہوتا ہے ان کے تلامذہ میں جن شعرا کے نام ملتے ہیں ان میں عشرت بریلوی، فرحت دہلوی عیش دہلوی، کرم دہلوی قابل ذکر ہیں۔

لطف کا انتقال حیدرآباد میں ہوا۔ ان کی تاریخ وفات کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ لطف کے ہم عصر غلام حسین جوہر لکھتے ہیں۔

"درسنہ یک ہزار و دو صد و بست و ہشت ہجری وفات کرد"[2]

عبدالجبار ملکاپوری نے اپنے تذکرے میں لطف کا سن وفات ۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۲ء درج کیا ہے[3]۔

محمد عبداللہ خاں ضیغم نے بھی لکھا ہے کہ لطف ۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۲ء میں فوت ہوئے[4]۔ غلام مصطفیٰ سخن نے لطف کی وفات پر قطعۂ تاریخ قلم بند کیا تھا۔ جس سے ان کا سنہ وفات ۱۲۳۳ھ نکلتا ہے۔ یہ قطعہ ان کے دیوان میں شامل ہے:

لطف با صد خوبی و لطف تمام
کرد منزل ہائے ہستی را چو طے
گفت سال رحلتش پیر خرد
وقت آن اہل کمال عصر ہے

۱۲۳۳ھ
۱۸۱۷ء

---

[1] تذکرہ ہندی (مرتبہ مولوی عبدالحق) اورنگ آباد ۱۹۳۳ء ص ۲۰۱ [2] گلزار آصفیہ ص ۴۵۰
[3] تذکرہ محبوب الزمن ص ۹۷۲ [4] یادگار ضیغم ص ۵۵۲
[5] دیوان سخن (قلمی مخزونہ کتب خانہ آصفیہ) ص ۶۳ (ب)

لطفؔ تخلص کے دیگر شعراء

تذکروں میں لطفؔ تخلص کے ایک سے زاید شاعروں کا ذکر ملتا ہے ان میں دو،
لطفؔ بریلوی اور میر امّن لطفؔ دہلوی ایسے ہیں کے بارے میں اصحاب کو یہ مغالطہ ہوا ہے
کہ وہ مرزا علی لطفؔ ہیں۔ ذیل میں ان شعراء کے بارے میں مختصراً روشنی ڈالی جائے گی جن کا
تخلص لطفؔ تھا اور جن کا حال تذکروں میں درج ہے۔

۱۔ میر امّن لطفؔ:۔

لطفؔ تخلص، میر امّن نام دہلی کے رہنے والے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ
کے منشی تھے اپنی تصانیف "باغ و بہار" اور "گنج خوبی" کے لیئے مشہور ہیں۔

۲۔ لطف علی خاں:۔

لطف علیخاں نام اور لطفؔ تخلص۔ ان کا شمار ایران کے امراء میں ہوتا تھا۔ مقالات
الشعراء مولفہ قیام الدین حیرتؔ اکبر آبادی میں ان کا ذکر ہے۔

۳۔ میر لطف علی خاں:۔

میر لطف علیخاں نام تھا اور لطفؔ تخلص کرتے تھے عربی اور فارسی کے عالم تھے ان کی وفات
۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۶ء میں ہوئی۔

۴۔ لطف علی:۔

لطف علی نام، لطفؔ تخلص، ایران کے رہنے والے تھے۔

۵۔ حفیظ اللہ لطفؔ:۔

حفیظ اللہ نام لطفؔ تخلص کرتے۔ شیخ ابراہیم ذوقؔ کے شاگرد تھے۔

۶۔ میر لطف علی خاں:۔

میر لطف علیخاں نام، لطفؔ تخلص لکھنو کے رہنے والے تھے بعد میں انہوں نے دہلی آکر بودوباش

اختیار کرلی تھی۔

۷۔ لطف اللہ :۔

لطف اللہ منشی لطف اللہ نام اور لطف تخلص تھا۔ ملازم سرکار ہونے سے قبل نواب میر جعفر علی خاں بہادر کے یہاں ملازم تھے۔

۸۔ لطف علی :۔

لطف علی لطف تخلص، لطف علی نام تھا۔ بریلی کے رہنے والے تھے۔ زیادہ تر نعت کہتے تھے۔

۹۔ لطف الدین خاں :۔

لطف الدین خاں نواب محمد لطف الدین خاں نام تھا، لطف تخلص، لطف جنگ اور لطف الدولہ ان کے خطابات تھے۔ حیدرآباد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ان کی ولادت ۱۸۸۳ء کو اور وفات ۱۹۴۱ء میں ہوئی۔

تذکرہ "گلشن ہند" کے مرتب مرزا علی لطف کو لطف تخلص کرنے والے شعراء سے ممیز کرنے کے لیے راقم الحروف نے جو تفصیلی بحث کی ہے وہ "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" میں درج ہے[1]۔

---

[1] ۔ حیدرآباد (۱۹۷۹ء ص (۹۰ تا ۹۵)

لطف کا تغزل

لطف ایک باکمال غزل گو شاعر ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے نہ صرف یہ کہ شاعر کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ اس سے عہد بہ عہد ادبی رجحانات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھی پتا چلتا ہے۔ لطف کی شخصیت کی تعمیر میں جہاں دہلی کے ماحول کا ہاتھ رہا وہیں لکھنو کی تہذیب اور معاشرت نے بھی نمایاں حصہ لیا ہے۔ لطف کی شاعری کا آغاز دہلی میں ہوتا ہے اور لکھنو میں ان کی شاعری پروان چڑھتی ہے۔ دہلی میں جب تک رہے میر اور سودا کو وہ اپنا امام سمجھتے رہے غالباً اسی لیے اس دور کی غزلوں میں میر کی سادگی اور سودا کا بانکپن ملتا ہے۔ بحروں کے انتخاب، زبان اور انداز بیان میں بھی میر کے مقلد نظر آتے ہیں اُن کے بعض اشعار میں جو سہل ممتنع قسم کے ہیں۔ میر سے بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس خصوص میں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

میر :-

انکھڑیوں کو اس کی خاطر خواہ کیوں کر دیکھیے
سو طرف جب دیکھ لیجیے تب اودھر دیکھیے

لطف :-

نہ آنکھ بھر کے کبھی ڈر سے ہم تو دیکھ سکے
وہ سامنے بھی اگر اپنے ایک آن رہا

میر :-

عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

لطف :-

گئی جوانی آئی پیری موئے سیہ سب ہوئے سپید
تا کے غفلت، جاگ اے غافل، صبح ہوئی اب رات نہیں

میرؔ:۔

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

لطفؔ:۔

پاسِ ناموسِ محبت فرض ہے پروانہ وار
شمع سا ں سوزِ شبِ ہجراں زباں پہ لائیں کہاں

لطفؔ کے اس دہلوی رنگِ سخن کا اثر ہمیں غالبؔ کے کلام میں بھی نظر آتا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ غالبؔ نے براہِ راست لطفؔ سے اکتساب کیا ہو۔ لیکن بعض جگہ غالبؔ نے ایسی بحروں اور زمینوں میں فارسی الفاظ وتراکیب کا انتخاب کیا ہے جو لطفؔ کے یہاں بھی بکثرت نظر آتی ہیں۔ اور بعض مقامات پر مضامین میں بھی توارد موجود ہے چنانچہ لطفؔ کے دیوان کا پہلا شعر ہے

زیبِ لوحِ عرش سیع مصرع ہے بسم اللہ کا
واہ رے پُرسادہ وپُرکار مصرع آہ کا

سادہ وپُرکار کا استعمال غالبؔ کے یہاں دیکھئے:۔

سادہ وپُرکار ہیں خوباں غالبؔ
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

غالبؔ:۔

قیدِ حیات وبندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اسی مضمون کو لطفؔ نے اپنے ڈھنگ سے باندھا ہے۔

مرجائیں تو چھٹ جائیں اس روز کے مرنے سے
پر کیا کریں ہے یاں تو مرنے کا ہی دھب مشکل

غالب :-

تیرے سروِ قیامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

لطف :-

دیکھ کر سرو کو کل یاد جو آئی مجھکو
کیا قیامت تری قامت نے دکھائی مجھ کو

غالب :-

چاک مت کر جیب بے ایام گُل
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے

لطف :-

ہو نہ ادھر سے کشش تو ہم ضعیفوں سے ہو کیا
کہربا کے ساتھ وابستہ ہے جلوہ کاہ کا

لطف جب لکھنؤ پہنچتے ہیں تو ان کی شاعری میں ایک نیا موڑ آتا ہے جہاں اُن کے کلام میں پختگی اور زبان میں بے ساختگی پیدا ہوئی وہیں وہ موضوع کے اعتبار سے دبستانِ لکھنؤ کے معیار کو بھی پہنچ جاتے ہیں اگرچہ کہ اس وقت دبستانِ لکھنؤ کی باقاعدہ تشکیل عمل میں نہیں آئی تھی تاہم یہاں کی ادبی فضا دہلی سے یکسر مختلف تھی۔ آصف الدولہ کا زمانہ فنونِ لطیفہ اور شعر و ادب کے عروج کا زمانہ تھا لکھنؤ معاشرت، عورت، موسیقی اور شاعری سے عبارت ہو کر رہ گئی تھی۔ لکھنؤ کی نزاکت طبع کا اثر شاعری اور موسیقی پر خاص پڑا۔ اب غزل کے تصورِ محبوب میں عورت کی جنس واضح نظر آنے لگی۔ شاعری میں صنفِ نازک کے خد و خال آرائش و زیبائش اور اُس کے صفات کو پیش کرنا ہی کمالِ فن سمجھا جانے لگا۔ لیکن دوسری طرف صحتِ زبان، روزمرہ اور محاوروں کی بندش، الفاظ کی در و بست و چستی نئی ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں پر بھی بطور خاص توجہ دی جانے لگی۔ شاعری صنعت گری اور رعایت لفظی میں

محدود ہو کر رہ گئی ایک طرح سے شاعری کی یہ خصوصیات ' لکھنوی تہذیب کی مکمل آئینہ دار ہے اور اسی تہذیب کا عکس لطف کی شاعری میں جابجا ملتا ہے ۔

چند شعر ملاحظہ ہوں :۔

کمر اہلِ وفا کے قتل پہ جو دلربا باندھے
کوئی کیا اُس دغا دشمن سے پھر عہدِ وفا باندھے

اُڑا کیوں رنگ ہے چہرے کا یہ فرمایئے صاحب
گنوا بیٹھے کہیں دل بس نہ اب شرمایئے صاحب

لطف کے یہاں سنگلاخ اور مشکل زمینوں کی بھی کمی نہیں ہے اس رجحان کا مقصد ایک طرف تو ہم عصروں میں اپنی اُستادانہ حیثیت منوانا ہے تو دوسری طرف قادرالکلامی، پرگوئی اور علم عروض پر کامل مہارت کا اظہار بھی ہے ۔ دبستانِ لکھنو کی عام روش کے مطابق لطف نے سنگلاخ زمینوں میں بھی بڑے اچھے اشعار نکالے ہیں ؎

کہتے ہیں ختم لعل پہ یہ سنگ رنگ ڈھنگ
کب ہے تری کفک (سے) بیانگ رنگ ڈھنگ

انصاف کر بھلا نہ جلوں کیوں کہ رشک سے
ہنس کے بغل میں تجھ کو لئے تنگ رنگ ڈھنگ

دیکھا نہ ایک پل کے لئے بھی انھیں جُدا
یارب گرہ ہے دامنِ مژگاں وآستین

کیا جانے لائی باغ میں کس گل کی بو ہمیں
رشکِ چمن تھا ورنہ یہ داماں و آستیں

تشبیہ و استعاروں میں بھی لطف کے یہاں دبستان لکھنؤ سے مخصوص روایتی رنگ ملتا ہے اس میں شک نہیں کہ تشبیہ اور استعارہ صنعتِ کلام کا زیور ہے جس سے شعر کے حسن میں اضافہ اور اثر آفرینی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے لیکن اس کے استعمال میں خاص سلیقہ، تناسب اور فن کارانہ صلاحیت کا ہونا ضروری ہے دبستانِ لکھنؤ کے شاعروں نے تشبیہ استعارہ اور صنعتِ کلام کو کچھ اس طور پر برتا ہے کہ شعر کی لطافت باقی نہیں رہتی اور وہ ایک چیستان بن کر رہ گیا ہے۔ اپنے عہد کے اس رجحان سے لطف بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

ناخن پہ دل ہلال ہے ابرو کے رشک سے
مکھڑے پہ داغ رکھتا کلیجے پہ ماہ ہے

خوبی کا تیرے بالوں کے مذکور ہے جہاں
سنبل کا نام اُس جگہ اک روسیاہ ہے

اس میں شک نہیں کہ لطف نے دبستانِ لکھنؤ کا بھی اثر قبول کیا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کا کلام دلکش تشبیہوں اور پُر لطف استعاروں سے یکسر خالی ہے

لطف نے ابتداً دبستان دہلی کا رنگ قبول کیا تھا، اور اس کا پرتوِ جمال بعض اچھوتی تشبیہوں اور استعاروں کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔

خورشید کی بھی آنکھ فلک پر جھپک گئی
ٹک جو گرہ نقاب کی اس کی سرک گئی

کبھی تو قافلہ ٹھہرا ہے سینۂ چاکوں کا
نہیں ہے اب جرسِ دل کی کچھ صدا پیدا

اس شعر میں جرسِ دل کے خاموش ہو جانے کو قافلہ کے جانے سے تشبیہ دی ہے۔
میر نے بھی ایک شعر میں صوتِ جرس کا مضمون باندھا ہے لیکن وہ آوازِ جرس کو اپنی تنہائی سے تشبیہ دیتے ہیں ؎

ایک بیاباں برنگِ صوتِ جرس
مجھ پہ ہے بیکسی و تنہائی

لطف کے کلام میں عشقِ مجازی کے تصور سے عشقِ حقیقی کا تصور اُبھرتا ہے اور اس جگہ وہ مسائلِ معرفت چھیڑ دیتے ہیں۔ عشقِ حقیقی کی راہ انتہائی کٹھن اور دشوار گذار ہوتی ہے اور وہی جرأت اور استقامت سے اس راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں جن کے ہاں حقیقی تڑپ اور صفاتِ باطنی و ظاہری کو سوچنے، سمجھنے کا شعور ہوتا ہے۔ لطف کے ہاں جو تصوف ہے وہ باقاعدہ فلسفہ کی شکل میں نہیں ہے اس لیے اس میں اُن رموز و نکات کی تشریح نہیں ملتی جو راہِ سلوک کے منازل سے مخصوص ہے اور نہ ہی وحدت الشہود یا وحدت الوجود کا کوئی مسلک ملتا ہے بلکہ وہ سیدھے سادے انداز میں اُس حقیقت کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں جو چشمِ بینا سے نظر نہیں آتی مگر اس کے باوجود ساری کائنات میں جاری و ساری ہے ؎

کعبہ سے ہم نہ واقف نے بُت کدے سے آگاہ
یاں آستانِ دل ہے اور جبہ سائیاں ہیں

اسی متصوفانہ رنگ میں وہ کائنات کے رموز اور اسرار کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عارفانہ سوجھ بوجھ اور دروں بینی کے باعث انھیں حقیقتِ کائنات کا ادراک ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو اس عالمِ رنگ و بو کے گرد کھینچے ہوئے حصار میں مقید پاتے ہیں۔

اللہ قید خانہ ہستی کہ دم کے ساتھ
ہر اک قدم پہ لاکھوں ہیں زنداں لگے ہوئے

آہ کیدھر کو چلے جاتے ہو چھوڑے تنہا
ہم ہو ہم بھی مسافر ہیں اسی منزل کے

قصیدہ نگاری

لطفؔ ایک باکمال اور قادرالکلام غزل گو ہی نہیں بلکہ کامیاب قصیدہ نگار بھی ہیں۔ حیدرآباد میں نواب ارسطو جاہ اور میر عالم کے دربار سے وابستگی نے انھیں قصیدہ نگاری کی طرف مائل کیا اور انھیں اس صنفِ سخن میں اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقعہ ملا۔

لطفؔ نے کل پانچ قصائد کہے ہیں جن میں چار میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے وزیرِ اعظم نواب ارسطو جاہ دیوانِ دکن کی مدح میں ہیں اور ایک قصیدہ میر عالم دیوانِ دکن کی مدح میں ہے۔

پہلا قصیدہ جو نواب ارسطو جاہ کی مدح میں لکھا گیا ہے وہ (۱۰۱) اشعار پر مشتمل ہے اس کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ یہ قصیدہ ارسطو جاہ کو اعظم الامرا کے خطاب ملنے کی تہنیت میں کہا گیا ہے۔

ہوں آشنائے بحرِ سخن کیوں نہ لطمہ خوار
عمانِ مدح کا ترے پیدا نہیں کنار
نظارۂ علوئے مراتب میں سایہ سال
ہیں سر بہ پا بلند فراشانِ روزگار
زینے شمار کب ہوں تیرے اوجِ قدر کے
ہے اوّلِ قدم یہاں ختم آخر شمار
حاشا کے اعظم الامرا کے خطاب سے
ہوا ے چراغِ چشم کیاں تجھ کو افتخار
کیوں کر کے مائدہ بہ صفا دید کے تیرے
کتنے ہی اعظم الوزرا ہوں گے ریزہ خوار

ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اس قصیدہ کے اشعار کی تعداد ۷۵ بتلاتے ہوئے

لکھا ہے کہ اس کے دو مطلعے ہیں[1]۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس میں تین مطلعے ہیں اور اس طرح اس قصیدہ کے جملہ اشعار کی تعداد (۱۰۱) ہو جاتی ہے۔

لطف نے یہ قصیدہ ناصر علی سرہندی کے مشہور قصیدہ کے جواب میں اسی زمین میں لکھا ہے۔

لطف کا مطلع :۔

اے ذرہ ہا ز نامِ تو خورشید اعتبار
تاثیر اسم اعظم از اسم تو آشکار

ناصر علی کا مطلع :۔

اے شانِ حیدری زجبینِ تو آشکار
نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار

اس قصیدہ میں لطف نے شاعرانہ تعلّی سے کام لیتے ہوئے خود کو ناصر علی سرہندی پر ترجیح دی ہے اور استدلال یہ پیش کیا ہے کہ ناصر علی کے اشعار اہل معنی کی گرفت سے نہ بچ سکے۔ لیکن میرے اشعار پر اگر حاسد بھولے سے بھی حرف گیری کرے تو پھر اپنی اس حرکت پر مارے ندامت کے وہ اپنی انگلی کاٹ لے گا۔

ناصر علی وقت کہوں گر میں آپ کو
اس کو مجھے بجان سخن گر ہو افتخار
کیوں کر کہ اُس کے جادۂ افکار کا جگر
اکثر گرفتِ اہلِ معنی سے ہے فگار
اور طبع زاد پر مرے گر سہو سے حسود
انگلی لگے تو کاٹے بہ دندان انکسار

اس قصیدہ میں تشبیب اور گریز نہیں ہے اس کے باوجود یہ لطف کے قصائد میں گل سرسبد ہے اس قصیدہ میں صنائع بدائع بھی ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر ثمینہ شوکت مثنوی لطف ۱۹۷۲ ص ۳۲

اور شگفتہ تشبیہات بھی۔

غالب نے ایک جگہ لکھا ہے ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ہی ذریعۂ عزت نہیں مجھے

یہ عجیب اتفاق ہے کہ لطف نے بھی فنِ سپہ گری ہی کو فنِ شاعری کے مقابلے میں وجہ افتخار اور باعث عزت سمجھا ہے۔

قصیدہ میں وہ لکھتے ہیں:۔

کیوں کر کہ شاعری مری میراث کچھ نہیں
نے فخر میں سمجھتا ہوں اس کو نہ ننگ و عار
فن سپہ گری میں وہ ہے کسب کونسا
جو جانتا نہیں میں بہ تائید کردگار
پر اپنا ذکر اپنی زباں سے نہیں ہے خوب
کھل جائے گا وہ تجھ پہ کسی روز وقتِ کار

غالب نے بادشاہ ظفر کی مدح میں اپنے ایک قصیدہ میں حسن طلب سے کام لیتے ہوئے تنخواہ میں اضافہ اور ماہ بہ ماہ ایصال کرنے کی استدعا کی تھی ؎

میری تنخواہ کیجیے ماہ بہ ماہ
تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

اسی طرح لطف نے بھی حسن طلب سے کام لیتے ہوئے بڑے پر لطف انداز میں تنخواہ میں اضافہ کرنے کی خواہش کی ہے:۔

سرکار سے ہے تیری جو راہِ تفضلات
ہے ڈیڑھ سو روپے تیرے خادم کا ماہوار
ہر چند جائے شکر ہے پر عرض کیا کروں
جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل اور نہار

بے گفتگو پچاس تو ان ڈیڑھ سو میں سے
ہو کر سوار چھاتی پہ لے جاتے ہیں کہار
خالقِ خدا کا بار اٹھاتی ہے پالکی
میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار
باقی جو سو رہے کئی دن میں زباں پہ ہے
مثلِ مجردات فقط ان کا ہے شمار
پیزار اک جو لوں ہر دشمن کے واسطے
بیزار جی سے ہوں تو نہیں بنتا بازار
از بس کہ کم دماغ ہوں ضیق معاش سے
بالفعل تو اضافہ کا ہوں گا امید وار
لیکن نہ وہ اضافہ جو ہووے برائے نام
کافر ہوں سو پچاس میں جو ہو کشودِ کار

لطف کا دوسرا قصیدہ لامیہ ہے جو نواب ارسطو جاہ کی مدح میں کہا گیا ہے اور (۱۵۷) اشعار پر مشتمل ہے اس قصیدہ کے دو مطلعے ہیں سیاق اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ عید کے موقعہ پر پیش کیا گیا ہے۔

لطف کا تیسرا قصیدہ بھی نواب ارسطو جاہ کی مدح میں ہے جو کیواں جاہ متبنیٰ ارسطو جاہ کی تسمیہ خوانی کے موقعہ پر کہا گیا ہے۔ اگرچہ کہ اس قصیدہ میں مطلع نہیں ہے لیکن اس کی تشبیب بہت دلچسپ ہے۔ تشبیب کے آٹھویں شعر میں کیواں جاہ کا نام لیتے ہوئے مدح کی جانب گریز کی گئی ہے یہ (۲۵) شعر کا قصیدہ ہے نہ جانے لطف نے کیوں اس قصیدہ کو مطلع سے محروم رکھا۔ اس کی تشبیب نہایت مربوط، بحر مترنم اور اشعار رواں ہیں۔

چوتھا قصیدہ بھی نواب ارسطو جاہ کی مدح میں کہا گیا ہے یہ قصیدہ (۱۲۸) اشعار پر مشتمل ہے اور اس کی ابتدا میں مطلع موجود نہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس قصیدہ کا گیارہواں شعر مطلع ہے۔

اس قصیدہ کے ایک شعر میں مبالغہ کی دلچسپ مثال ملاحظہ کیجئے۔

لائے پھر تیری شمیمِ خلق اس کو اس کی جا
سرکی گر جاگہ سے نافِ آہوے تاتار ہے

انسان کی ناف جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے ٹل جاتی ہے لیکن لطف نے آہوے تاتار کی ناف ٹلنا باندھا ہے۔

پانچواں قصیدہ میر عالم کی مدح میں کہا گیا اور (۶۶) اشعار پر مشتمل ہے اس قصیدہ میں دو مطلع ہیں۔

پہلا مطلع استفساریہ ہے اور یہ استفسار بھی تجاہل عارفانہ کی قسم کا ہے تشبیب میں انصاف کی تعریف کرتے ہوئے گریز کر کے میر عالم کی مدح کی گئی ہے

لطف کے قصائد میں رعایت لفظی اور تشبیہات اور استعارات کی بڑی دلچسپ مثالیں ملتی ہیں۔ رعایت لفظی سے تو لطف کو خاص شغف رہا ہے انہوں نے اپنے قصائد میں لفظی اور معنوی مناسبتوں کا بہت ہی خوبصورتی اور مہارت سے استعمال کیا ہے ذیل کے اشعار میں رعایت لفظی کا التزام ملاحظہ ہو۔

شبوں کو شمع کے شعلے سے ہنگام ہم آغوشی
پرِ پروانہ لیتا ہے مزا بالِ سمندر کا

ہے زیر راں ترے جو وہ دیو پری جمال
کحلِ ضیائے چشم صباحسن کا ہے غبار

ہو غرقِ موجِ کشتیِ آبِ گہر سپہر
عماں کف سے ہو تری گر ابرِ سایہ دار

ہیں جو اُس کے جامِ طبع پاک کے یاں جرعہ کش
دُرد اُن کے سامنے ہے ساغرِ جم کا زُلال

تیرے آگے قدر رکھتی ہے شمیمِ زلفِ یار
یاں خجل مشکِ ختن اور نافہ تاتار ہے

تشبیہات:۔

مرہم زخم غریباں بس کہ اُس کا لطف ہے
شام غربت سے عیاں ہے خندۂ صبح جمال

"لطف" کو "مرہم زخم غریباں" کہنا اچھی تشبیہہ اور تعبیر ہے۔

ہے سبک رو مثل آب اور خاک اڑاتا شکل باد
گرم خون مانند آتش ہے وہ کوہ اعتدال

اس شعر میں آب وخاک، باد وآتش عناصر کے اجتماع کے علاوہ ہاتھی کو کوہِ اعتدال کہہ کو تشبیہہ میں ندرت پیدا کی گئی ہے

صنعت تضاد:۔

سر پر نکتہ دانی پر یہ دعویٰ شہنشاہی
بحق راستی حق ہے مرا کج رکھنا افسر کا

گو مہر قدر دانی کا تیرے نہ ہو فروغ
ہو اور علم آج شب جہل سے بھی تار

کہ مدح و ذم میں مملوا کے جہاں میں ہووے تو ہر گز
نہ ہوں دیندار کا مدّاح نے ہاجی ہوں کافر کا

صنعت تکریر:۔

ابر دیم بے ساختہ خجلت سے پانی پانی ہیں
دیکھ اس ذی جود کا فیضِ کف دریا نوال

سُن کے یہ مژدہ صبا سے ہوگیا دل باغ باغ
عقل بولی یہ تیرے اقبال کا آثار ہے

تنسیخ الاعداد :۔

تھا اگر حریف اس کا پیادہ تو دو ہوا
اور چار پارہ اس نے کیا تھا اگر سوار

ایہام :۔

ادب سے دور ہے عرض مکرّر لطف سے ہر چند
مزہ ہے لطف کی تکرار میں خندۂ مکرّر کا

پہلے مصرعے میں لطف شاعر کا تخلص ہے اور دوسرے مصرعے میں لطف بہ معنی مہربانی آیا ہے اس ایہام سے حقیقت میں خندۂ مکرر کا مزہ پیدا ہوگیا ہے۔

جب بخور عنبر علیش و صدائے عود جشن
مل کے دونوں نے بہم تا عرش اعظم راہ لی

پہلے مصرعے میں بخور بہ معنی لوبان وغیرہ کا دھواں ' صدائے عود بہ معنی مشہور ساز عود کی آواز ۔ عود کے ایک معنی لوبان کے ہیں یہاں دوسرے معنوں سے ایہام پیدا کیا گیا ہے ۔

کنایہ :۔

خبر جس دن نہ ہووے خلق کو جیب و گریباں کی
ہو میرا ہاتھ اُس دن اور داماں ہو ساقی کوثر کا

جس دن خلق کو جیب و گریباں کی خبر نہ ہو وہ کونسا دن ہو سکتا ہے فوراً ذہن منتقل ہوتا ہے روزِ محشر کی طرف ۔ سرعت انتقال ذہن کی یہی خوبی اس کنایہ کی جان ہے ۔

حسن تعلیل

معدلت سے اس کے ہے کوتاہ یاں دستِ ظلم
عود کو دیتے ہوئے ڈرتا ہے مطرب گوشِ مال

عود (مشہور ساز) کو سازندہ آمادہ کرتے (ملاتے) وقت اس لئے زیادہ پیچ نہیں دیتا کہ کہیں تار ٹوٹ نہ جائے لیکن لطف اس کی یہ علت بیان کرتے ہیں کہ ممدوح کی عدالت کی وجہ سے ظلم کا ہاتھ یہاں تک کوتاہ ہوگیا ہے کہ ساز کو گوشمالی دیتے ہوئے ڈرتا ہے۔

صیقل طلب ہوا نہ ترے چہرائے سے
رہ جائے کیوں نہ ماہ کا آئینہ لکّہ دار

شاعر چاند میں دھبّوں کا سبب یہ بتاتا ہے کہ ممدوح کی صورت سے چاند نے صیقل طلب نہیں کی یا اکتساب نہیں کیا اس لئے چاند میں دھبّوں کا رہ جانا ضروری ہے۔

لف ونشر:۔

جہاں میں جب تلک زہر و شکر تلخیٔ و شیرینی
کریں معمول پر اپنے اثر کیا خیر کیا شر کیا

لطف بہ حیثیت مثنوی نگار

لطف نے غزل اور قصیدہ کے علاوہ صنف مثنوی کو بھی اپنی طبع کا موضوع بنایا ہے۔
ان کی مثنوی "نیرنگ عشق" جو ۱۲۲۷ء سے قبل کی تصنیف ہے[1] اپنے عہد کی دلچسپ مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔ (۴۱۱) اشعار پر مشتمل اس مثنوی کو ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے مرتب کرکے ۱۹۶۳ء میں حیدرآباد سے شایع کیا تھا۔
جہاں تک مثنوی کے فنی محاسن کا تعلق ہے لطف نے جگہ جگہ اٹھارویں صدی

---

[1] ڈاکٹر ثمینہ شوکت مثنوی لطف (موسوم بہ نیرنگ عشق) (حیدرآباد ۱۹۶۲ء) ص ۷۹

عیسوی کی مثنوی نگاری کے عام رجحانات کے اعتبار سے فنی لوازم اور شرائط کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مثنوی کا قصّہ نہایت مربوط ہے اور اس میں قارئین کی دلچسپی کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہے کوئی واقعہ ایسا نہیں بیان کیا گیا ہے جو قصّہ کے تسلسل اور وحدتِ تاثر پر اثر انداز ہو اور جس کی وجہ سے پلاٹ میں جھول پیدا ہو جائے۔ واقعات نگاری میں بالعموم اختصار سے کام لیا گیا ہے اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی جزئیات کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے۔

مثنوی نگاری کی عام روایت کے برخلاف لطف نے فوق الفطرت عناصر سے بہت کم کام لیا ہے لطف کی مثنوی میں صرف ایک واقعہ خلاف فطرت ملتا ہے قبر کا شق ہونا اور نوجوان سے شہزادی کا ہم آغوش ہو جانا لیکن یہ واقعہ ان لوگوں کے لیے خلاف فطرت نہیں ہے جو کرامات اور خرق عادت میں یقین رکھتے ہیں۔

مثنوی لطف تین اہم کرداروں کے گرد گھومتی ہے سب سے اہم کردار ایک آشفتہ مزاج نوجوان کا ہے جو اس مثنوی کا ہیرو ہے دوسرا کردار شہزادی کا ہے جو اس مثنوی کی ہیروئن ہے اور تیسرا درویش کا کردار ہے ان کرداروں کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے کردار اس مثنوی میں شامل ہیں۔

داستانوں اور مثنویوں میں ناولوں کی طرح جدید انداز کی کردار نگاری کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ لطف نے مثنوی کے پلاٹ کو سیدھے سادے انداز میں پیش کیا ہے کرداروں میں مثنوی کے ہیرو کو نمایاں طور پر متعارف کروایا گیا ہے چونکہ مثنوی ایک ہی واقعہ کے اطراف گھومتی ہے اسی وجہ سے لطف نے ہیرو کے مرکزی کردار کو ابھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ نوجوان عشق میں مبتلا ہے اُس کی اس اضطراری کیفیت کو عشق حقیقی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

نیرنگ عشق ایک حزنیہ مثنوی ہے جس میں بزم آرائی اور بہاریہ منظر کشی کا موقعہ نہیں ملتا اور نہ اس مثنوی میں اس کی گنجائش تھی۔ اس کے باوجود لطف نے منظر نگاری کے بھی نمونے پیش کیے ہیں بہار کے موسم کا مرقع، نوجوان کے وہاں پہنچنے کا حال لطف نے بہت حسین انداز میں پیش کیا ہے۔

اتفاقاً اُن دنوں تھی فصلِ گل
بلبلوں کو تھا میسّر فصلِ گل
زورِ کیفیت سے آئی تھی بہار
مژدہ دیوانوں کو لائی تھی بہار
سبز و خُرم ہر خس و خاشاک تھا
صحنِ صحرا گنبدِ افلاک تھا
تھا زمرّد گوں بساطِ مرغزار
قطعۂ مخمل میں آبِ جوئبار
دیکھ دیوانے نے یہ صحرا کا جوش
بے تحاشا کر اٹھا دل سے خروش
پھر تو کی شورش جنوں نے اس قدر
فصلِ گل کی بھی نہ تھی اس کو خبر
ہم فغاں ہوتا تھا بُلبل سے کبھی
جا اُلجھتا زلفِ سُنبل سے کبھی
روتا قمری کی کبھی فریاد سے
گہہ بگڑتا وہ قدِ شمشاد سے
شورِ طاؤساں سے گھبراتا کبھی
پات کے کھڑکے سے ڈر جاتا کبھی
نالہ آموزِ عندلیبوں کا تھا گہہ
گاہ تھا آبِ رواں کا سبزہ رہ
ہم زبانی اس کو گہہ سوسن سے تھی
گاہ نرگس سے بندھی تھی ٹکٹکی
خندۂ گل پر کبھی روتا تھا زار
گریۂ شبنم پہ ہنستا بے شمار

لطف نے اس مثنوی میں بعض مقامات پر مکالمہ نگاری کے ذریعہ قصہ میں ڈرامائی انداز پیدا کیا ہے شہزادی نوجوان کے مسکن پر پہونچ کر اپنی کنیز کو درویش کے پاس بھیجتی ہے تاکہ اس کے ذریعہ نوجوان کا پتا معلوم کرے ۔ لطف کی مکالمہ نگاری کا انداز ملاحظہ ہو۔

بولی یوں اک خادمہ سے بے حجاب
پوچھ اس درویش سے جا کر شتاب
آج وہ دیوانۂ آفت قریں
کیا سبب ہے جو نظر آتا نہیں
جوش وحشت میں مگر وہ مستند
اور کوئی دشت کر بیٹھا پسند
لا خبر اس بے خبر از خویش کی
سینہ چاک و جان بلب درویش کی
دیکھ یوں اس شمع رو کو بے قرار
مضطرب یاں سے چلی وہ شعلہ وار

مثنوی کی عام دلچسپی اور فنی محاسن سے قطع نظر اس میں بعض مقامات پر بے جا الفاظ کی تکرار کھٹکتی ہے اور قافیوں کے استعمال میں بھی لطف کو سہو ہوا ہے اور انہوں نے معروف و مجہول کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا جو قواعد فن کے لحاظ سے فاش غلطی ہے ؂

گر کوئی آزردہ یا خوش اس سے ہو
تھی کسی سے کچھ نہ اس کی گفتگو

"ہو" اور "گفتگو" اجتماع معروف و مجہول ہے جو غلط ہے یہاں یہ تاویل کی جا سکتی ہے کہ لطف چونکہ ایرانی نژاد تھے اور ایران کے اساتذہ معروف و مجہول کے فرق کو زیادہ معیوب نہیں سمجھتے اس لیے ان کی پیروی میں لطف نے اس اجتماع کو جائز رکھا ہے۔

لطف نے ایک جگہ دشتِ گل اور خطِ گل قافیہ کہا ہے ؂

کوہ اور صحرا سے بے تا دشتِ گل
تھی ہر اک تختہ پہ مشق خط گل

"دشتِ گل" اور "خطِ گل" غلط قوافی ہیں اگر "خطِ گل" کو نستعلیق کی اصطلاح میں خط کی ایک قسم مان لیا جائے اور پہلے مصرعے کے "گل" اور دوسرے مصرعے کے "گل" کو ردیف کی بجائے ہم ردیف وہم قافیہ سمجھا جائے تو "خطِ گل" "علم" ہونے کے اعتبار سے درست قافیہ ہے لیکن خطاطوں کی تقسیم کے لحاظ سے اس طرز کا صحیح نام "خطِ گلزار" ہے "خطِ گل" نہیں ہے۔

لطف کی رباعیاں

لطف کا جو کلام مختلف تذکروں اور مخطوطات میں دستیاب ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ لطف نے چھ اردو رباعیاں کہی ہیں۔ دیوانِ لطف میں صرف پانچ رباعیاں موجود ہیں۔ یہی پانچ رباعیات تذکرہ گلشن ہند سالار جنگ میوزیم لائبریری اور اسٹاف سی بیلیو تھک، جرمنی کے نسخوں میں موجود ہیں۔ ان پانچ رباعیات میں سے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے گلشن ہند کی ترتیب وتصحیح کے وقت دو رباعیاں ہی منتخب کی ہیں[1]

لطف کی سب رباعیاں ایجاز و اختصار کا اعلیٰ نمونہ ہیں رباعی کے بارے میں "گاگر میں ساگر" کی جو خصوصیات بیان کی جاتی ہیں، وہ خصوصیت لطف کی رباعیوں میں موجود ہے۔ لطف نے اپنی رباعی کے تین مصرعوں کو پسِ منظر قرار دیتے ہوئے چوتھے مصرعے میں اصل تصویر پیش کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی ہر رباعی کا چوتھا مصرعہ رباعی کی جان ہے۔

لطف نے زبان کے کسی محاورے کو اپنی رباعی کے چوتھے مصرعے کی بنیاد بنایا ہے یا ایسا برجستہ مصرعہ کہا ہے جس میں ضرب المثل ہونے کی صلاحیت ہے مثلاً یہ رباعی :-

جو کوئی کہ آفتِ نہانی مانگے	اور ملکِ عدم کی کچھ نشانی مانگے
دکھلادے اسے تو اپنی شمشیرِ نگاہ	جس کا مارا کبھی نہ پانی مانگے

---

[1] مرزا علی لطف تذکرہ گلشن ہند (مرتبہ شبلی نعمانی) لاہور ۱۹۰۶ء ص (۱۵۱)

لطف نے بعض رباعیاں کسی خاص تقریب یا خاص موقعہ پر کہی ہیں۔ مثال کے طور پر درج ذیل رباعی ملاحظہ کیجیے جو پیشکار دکن مہاراجہ چندو لعل شاداں کے "آئینہ محل" بنوانے کے موقعہ پر کہی گئی تھی۔

جنت سے کہے بزم میری ضو دیکھو
یوں جام کہے جم سے کہ مجھ کو دیکھو
ہر آئینہ، آئینہ محل کا تیرے
کہتا ہے سکندر سے کہ منہ تو دیکھو

"آئینہ محل" نام کی رعایت سے "ہر آئینے" کا استعمال اور پھر سکندر کی تلمیح اور "منہ تو دیکھو" کے طنز نے رباعی کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے۔

تاریخ گوئی لطف کو تاریخ گوئی میں بھی کمال حاصل تھا چنانچہ آصف الدولہ کے انتقال پر جو قطعۂ تاریخ کہا ہے وہ یادگار ہے۔ مادۂ تاریخ کے مصرعے (آج گلِ ہند کا چراغ ہوا) سے "پائے عناد" یعنی (۸۴) عدد کا تخرجہ کیا ہے۔

آصف الدولہ جب جہاں سے گیا
اک جہاں، بے دل و دماغ ہوا
جامِ عمر اس کا بھرتے ہی لبریز
خلق کا عیش کا ایاغ ہوا
دشمنوں کا دل آتشِ غم سے
دوستوں سے زیادہ داغ ہوا
سالِ تاریخ کا خیال کسے
خشک شعر و سخن کا باغ ہوا
بولے یوں دور کرکے پائے عناد
آج گلِ ہند کا چراغ ہوا
۱۲ ۱۲ ۵

راقم نے "مرزا علی لطف ۔ حیات اور کارنامے" کے موضوع پر اپنا پی ۔ ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ لطف عام طور پر اپنے تذکرہ "گلشن ہند" کے لئے مشہور ہیں لیکن اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں' میں نے محسوس کیا کہ ان کا کلام بھی ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ میر اور سودا کے معاصر کی حیثیت سے لطف کا کلام لسانی اور ادبی اعتبارات سے محققین کے لئے نئی راہیں کھولتا ہے۔ یہی احساس دیوان لطف کی تدوین و ترتیب پر مائل کرنے کا باعث ہوا اس سلسلے میں چھان بین کی تو عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں "دیوان لطف" کا ایک مخطوطہ دریافت ہوا۔ پھر ایک دلچسپ انکشاف یہ ہوا کہ لطف نے اپنے تذکرہ گلشن ہند میں جہاں خود اپنے حالات وغیرہ کا ذکر کیا ہے اس کے ساتھ اپنا تقریباً سارا کلام بھی درج کر دیا ہے اس طرح عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری کے مخطوطہ اور تذکرہ گلشن ہند کے دو مخطوطوں جو علی الترتیب اشاٹ سی بیلیوتھک' جرمنی اور سالارجنگ میوزیم لائبریری میں موجود ہیں' کی مدد سے راقم نے "دیوان لطف" کے متن کو مدون کرنے کے کام کا آغاز کیا۔

اس سلسلہ میں جب جرمنی کے مخطوطہ اور سالارجنگ میوزیم کے مخطوطہ کی چھان بین کی گئی اور دیوان لطف سے اس کا مقابلہ کیا گیا تو پتا چلا کہ جرمنی اور سالارجنگ کے نسخہ میں چند شعر زیادہ ہیں۔ جہاں تک جامعہ عثمانیہ کے نسخہ کا تعلق ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ "گلشن ہند" کے نسخہ اور نسخہ سالارجنگ کے مقابلے میں قدیم ہے اور دوسرے نسخوں کے مقابلے میں اس میں املا کی غلطیاں کم ہیں اس لیے بنیادی اہمیت جامعہ عثمانیہ کے مخطوطہ کو دی گئی ہے لیکن ایڈیٹنگ کے جدید اصول کو پیشِ نظر رکھ کر اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی ایک مخطوطہ کی غیر ضروری تقلید نہ کی جائے بلکہ مصنف کے ساتھ انصاف کرنے کی ممکنہ کوشش کی جائے۔ اس سلسلہ میں وہی متن قبول کیا گیا جو زبان اور اسلوب بیان کے اعتبار سے مصنف کی زبان اور اسلوب بیان سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہو۔ دیوان لطف کے متن کی تہذیب و ترتیب میں تین قلمی نسخوں سے استفادہ کیا گیا ہے جو کتب خانہ جامعہ عثمانیہ اشاٹ سی بیلیوتھک جرمنی اور کتب خانہ سالارجنگ کی زینت ہیں اس کے علاوہ دیوان لطف کے دو اور نسخوں کا پتا چلتا ہے۔

پہلے نسخہ کی "مجلس تحقیقات اردو' حیدرآباد دکن" کے کتب خانہ میں محفوظ رہنے کی اطلاع ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے ہم

پہونچائی ہے۔[1]

افسوس کہ پروفیسر عبدالقادر سروری اعزازی معتمد مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد دکن کے انتقال کے بعد یہ ادارہ بھی ختم ہوگیا پروفیسر سروری کے ورثا سے استفسار کیا مگر اس نسخے کا پتہ نہیں چل سکا۔

دوسرے نسخہ کی اطلاع پروفیسر سید محمد نے بہم پہونچائی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"ان کا (لطف) کلیات افسوس کہ لاپتہ ہے۔ مولوی غلام محمد صاحب وفا مالک تاج پریس حیدرآباد کے ہاں "دیوان منتخب" کے نام سے لطف کے کلیات کا نہایت معتبر اور نفیس انتخاب قلمی نسخہ کی صورت میں نظر آیا"[2]۔

راقم الحروف نے اس نسخہ کا پتہ چلانے کی بہت کوشش کی افسوس کہ نہ مولوی غلام محمد وفا ہی رہے اور نہ ان کا تاج پریس۔

مخطوطات کی کیفیت | موجودہ صورت میں دیوان لطف کے صرف تین قلمی نسخے دستیاب ہوتے ہیں جنھیں سہولت کی خاطر "ا، ب، اور ج" سے موسوم کیا گیا ہے۔

ا ۔ نسخہ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

ب ۔ نسخہ اسٹاٹ سی. ببلیوتھک، جرمنی

ج ۔ نسخہ سالار جنگ، حیدرآباد

(ا) نسخہ جامعہ عثمانیہ:۔ یہ نسخہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ کی ملکیت ہے کتب خانہ کی فہرست کے مطابق اس کا داخلہ نشان ۸۸۵ / ۱۲ ہے۔ یہ مخطوطہ $10\frac{1}{2} \times 5\frac{1}{2}$ سائز کے ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے[3]۔ ہر صفحہ پر سطور کی تعداد ۱۸، اور ۱۹ کے درمیان ہے۔ خط نستعلیق شکستہ اور کاغذ دیسی ہے۔ بعض مقامات پر مخطوطہ کرم خوردہ اور

---

[1] مثنوی لطف (حیدرآباد دکن ۱۹۲۲ء) ص ۲۲

[2] ارباب نثر اردو (حیدرآباد دکن ۱۹۳۷ء) ص ۱۳۷

[3] ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے دیوان لطف کے صفحات کی تعداد ۴۲، بتلائی ہے حالانکہ یہ ۲۴ اوراق اور ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے (ملاحظہ ہو مثنوی لطف م حیدرآباد دکن ۱۹۲۲ء ص ۲۲

آب زدہ ہوگیا ہے۔ پہلے صفحہ کی پیشانی پر یہ عبارت درج ہے :۔

" دیوان منتخب مرزا علی خان علیہ الرحمان "

بعد میں کسی نے " دیوان لطف از مرزا علی خاں " کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ نسخہ ۷۳ غزلوں، ۵ قصیدوں اور ۵ رباعیوں پر مشتمل ہے۔

غزلوں کے اشعار کی تعداد	=	۴۷۱
قصیدوں کے اشعار کی تعداد	=	۲۷۲
رباعیوں کے اشعار کی تعداد	=	۲۰
جملہ اشعار		۷۶۳

پہلے صفحہ پر " فاضل بیگ ولد صفدر بیگ " کی مہر ثبت ہے جس پر سنہ ۱۲۵۰ ہجری کندہ کیا ہوا ہے۔ اس مخطوطہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اکثر مقامات پر تخلص (لطف) بالکل غائب ہوگیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں کسی نے اس کو مٹانے کی کوشش کی ہے ابتدائیہ اور ترقیمہ بھی تحریر نہیں کیا گیا جس سے کاتب کا نام سنہ کتابت اور مقام کا پتا چل سکے۔ صرف مہر سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ سنہ ۱۲۵۰ ہجری کو یہ مخطوطہ " فاضل بیگ ولد صفدر بیگ " کی ملکیت بنا۔

مخطوطہ کے آغاز سے پہلے " رب یسر " " بسم اللہ الرحمٰن الرحیم " اور " وتمم بالخیر " لکھا ہے مخطوطہ کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔

زیب لوح عرش پہ مصرع ہے بسم اللہ کا
واہ رے پُر سادہ و پُر کار مصرع آہ کا

نے زمین سے آسماں تک عشق کو پایا محیط
ہے کتانِ دل چاک تو داغ جگر ہے ماہ کا

صدقہ اس ٹھوکر کے جس نے کر دیا کُرسی نشیں
فی الحقیقت ورنہ کیا رتبہ غبار راہ کا

حسب ذیل اشعار پر یہ مخطوطہ اختتام کو پہونچتا ہے۔

ہے دبیر چرخ پیر فلک آگے تیرے
مثل اطفال غبی موہنہ کھولے جوں طومار ہے
کر دعا پہ ختم بس اے لطف ہے ترک ادب
اور اجابت کا بھی اس امر میں اصرار ہے
گلشن اقبال تیرا نت رہے باآب و رنگ
دہر کا شاداب و خرم جب تلک گلزار ہے

نسخہ کے آخر میں بھی " فاضل بیگ ولد صفدر بیگ سنہ ۱۲۵۰ھ" کی مہر ہے۔

(ب) نسخہ اشاٹ سی بیلیوتھک، جرمنی: ۔ یہ نسخہ دراصل تذکرہ " گلشن ہند" (اشاٹ سی بیلیوتھک جرمنی) کے منتخب اشعار لطف پر مشتمل ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس نسخہ میں جامعہ عثمانیہ کے " منتخب دیوان لطف " سے بھی دو اشعار زیادہ ہیں۔ گلشن ہند اشاٹ سی بیلیوتھک، جرمنی، ۴۵۰ صفحات پر مشتمل ہے اور بہت ہی عمدہ خط نستعلیق میں تحریر کیا گیا ہے یہ نسخہ اسپرنگر کی ملکیت تھا جسے "ٹیوبن گن لائبریری" سے اشاٹ سی بیلیوتھک جرمنی کو منتقل کیا گیا۔ اس مخطوطہ میں لطف کا ذکر صفحہ نمبر ۲۷۹ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ نمبر ۳۵۹ پر اختتام کو پہونچتا ہے جس میں مثنوی لطف بھی شامل ہے ہر صفحہ پر سطور کی تعداد ۱۵ ہے۔ تقطیع ۱۰ x ۶½ ہے۔ دیوان کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔

زیب لوح عرش ہے مصرع ہے بسم اللہ کا
واہ رے پرسادہ و پرکار مصرع آہ کا
لے زمین سے آسماں تک عشق کو پایا محیط
ہے کتاں دل چاک تو داغ جگر ہے ماہ کا
صدقہ اس ٹھوکر کے جس نے کر دیا کرسی نشین
فی الحقیقت ورنہ کیا رتبہ غبار راہ کا

دیوان لطف کا اختتام قصیدہ کے حسب ذیل اشعار پر ہوتا ہے۔

کر دعا پر ختم بس اے لطف ہے ترکِ ادب
اور اجابت کا بھی اس امر میں اصرار ہے
گلشنِ اقبال تیرا نت رہے باآب و رنگ
دہر کا شاداب و خرم جب تلک گلزار ہے

اس کے بعد مثنوی شروع کی گئی ہے جو ان اشعار پر ختم ہوتی ہے۔

لطف بس بے ادب اتنا نہ ہو
منہ تو اپنا دیکھ اور یہ گفتگو
لائقِ انساں نہیں یہ خال و قیل
ہو جو مداحِ علی تو جبریل

اس نسخہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غزلوں کے اشعار بغیر کسی امتیاز کے لکھے گئے ہیں جب کہ جامعہ عثمانیہ کے نسخہ میں ہر غزل کی ابتدا میں "ولہ" کی سرخی درج ہے۔ بعض قصائد پر عنوانات بھی درج کئے گئے ہیں مثلاً دیوان کے آخری قصیدہ پر یہ عنوان درج ہے۔

"در تہنیت بسم اللہ کیواں جاہ بہادر"

اس نسخہ کا کاتب کم سواد معلوم ہوتا ہے اکثر مقامات پر اس نے اشعار غلط نقل کئے ہیں۔

(ج) نسخہ سالار جنگ، حیدر آباد (تذکرہ نمبر ۵) :۔ دیوان کا یہ نسخہ "تذکرہ گلشن ہند" کتب خانہ سالار جنگ حیدر آباد پر مبنی ہے جو (۹ x ۶) تقطیع کے (۸۲۶) صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر سطور کی تعداد ۱۲ تا ۱۴ ہے کاغذ دیسی، تاریخ تصنیف ۱۲۱۵ ہجری ہے۔ اس نسخہ میں دیوان لطف کا آغاز صفحہ ۱۲۲ (ب) سے ہوتا ہے۔ ابتدائی اشعار یہ ہیں:۔

زیب لوحِ عرش پر سجع مصرع ہے بسم اللہ کا
واہ رے پُر سادہ و پُر کار مصرع آہ کا
بے زمیں سے آسماں تک عشق کو پایا محیط
ہے کتاں دل چاک تو داغ جگر ہے ماہ

صدقہ اُس ٹھوکر کے جس نے کر دیا کرسی نشین
فی الحقیقت ورنہ کیا رتبہ غبار راہ کا

اس نسخہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ایک غزل ختم ہونے کے بعد کوئی نشان لگایا گیا ہے اور نہ ولہ کی علامت درج ہے جبکہ جامعہ عثمانیہ کے مخطوطہ میں ہر غزل کی ابتداء میں ہر ولہ کا نشان ملتا ہے۔ ابتداء میں غزلیں ہیں اس کے بعد قصائد اور رباعیاں شامل کی گئیں ہیں (۳۷) غزلیں (۴) قصائد اور پانچ رباعیاں شامل ہیں صرف ایک قصیدہ پر عنوان "امیر اعظم ارسطو جاہ بہادر" درج کیا گیا ہے یہ مخطوطہ نسخہ جرمنی اور جامعہ عثمانیہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ آب زدہ اور کرم خوردہ ہو گیا ہے کاتب بھی بہت کم سواد ہے اکثر مقامات پر اس نے املا غلط لکھا ہے اور جہاں کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آسکا اُسے چھوڑ دیا ہے۔ گلشن ہند کے اس نسخہ میں کلامِ لطف صفحہ ۱۹۳ (ل) تک محیط ہے۔ درج ذیل اشعار پر مخطوطہ اختتام کو پہونچتا ہے :-

کر دعا بس اے لطف ہے ترک ادب
اور اجابت کا بھی اس امر میں اصرار ہے
گلشنِ اقبال تیرا ہِت رہے باب ورنگ
دہر کا شاداب وخرم جب تلک گلزار ہے

اس کے بعد "مثنوی لطف" لکھی گئی ہے جو صفحہ (۹-۲) (ل) تک پھیلی ہوئی ہے اور ان اشعار پہ ختم ہوتی ہے۔

لطف بس اب بے ادب اتنا نہ ہو
مولہنہ تو اپنا دیکھ اور یہ گفتگو
لائقِ انسان نہیں یہ خال وقیل
ہو جو مداحِ علی تو جبریل

آخر میں املا اور تدوین کے ان اصولوں کی طرف اشارہ ضروری ہے جو "دیوان لطف" کی تہذیب وترتیب میں ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ مخطوطہ میں املا کی درج ذیل

خصوصیات قابل ذکر ہیں :۔

(۱) ک اور گ پر ایک ہی مرکز لگایا گیا ہے مثلاً کل (گل)، درکاہ (درگاہ) جاکا (جاگا، جگہ)، کریباں (گریباں) وغیرہ۔ اس قسم کے تمام الفاظ کی صورت میں ہم نے ک اور گ کا مروجہ املا استعمال کیا ہے۔

(۲) یائے معروف اور یائے مجہول میں بالکل امتیاز نہیں ہر جگہ ایک کے بجائے دوسری ملتی ہے جیسے دیکھی (دیکھے)، سی (سے)، کی (کے)، لی (لیے)، ای (اے)، آگی (آگے) وغیرہ۔

راقم نے یائے معروف اور یائے مجہول کو مروجہ املا کے مطابق درست کر دیا ہے۔

(۳) ہائے مخلوط کو ہائے ہوز سے لکھا گیا ہے جیسے تہا (تھا)، بہلا (بھلا)، اُدہر (اُدھر)، تہی (تھے)، الجہائیں (الجھائیں)، پہر (پھر)، کچہ (کچھ)، مجہ (مجھ)، سنبہل (سنبھل) وغیرہ۔ متن میں جہاں بھی "ہ" اور "ھ" میں خلط ملط کیا گیا ہے۔ ہم نے اُسے درست کر دیا ہے۔

(۴) غیر منقوط نون کی جگہ بھی نون منقوط لکھا گیا ہے مثلاً نہین (نہیں)، یون (یوں)، کیون (کیوں)، یقین (یقیں) وغیرہ۔ ایسی ساری صورتوں میں صوتی اعتبار سے جو لفظ درست ہے اسی کے مطابق لکھ دیا گیا ہے۔

(۵) ٹ، ڈ، ڑ پر "ط" کے نشان کی بجائے چار نقطے (::) لگاتے ہوئے ٹ، ڈ، ڑ لکھا گیا ہے یہ طریقہ دورِ قدیم میں رائج تھا ہم نے مروجہ طریقے کے مطابق اسے درست کر دیا ہے۔

(۶) بعض اوقات الفاظ کو ملا کر لکھ دیا گیا ہے جیسے آنکہونسی (آنکھوں سے)، اوندنو (اُن دنوں)، نکہتی (نہ کہتے)، ہوشمیں (ہوش میں)، جسی (جس سے)، ایشیخ (اے شیخ)، نالہائی (نالہ ہائے)، شمعسے (شمع سے) وغیرہ۔ اس قسم کی کتابت سے الفاظ کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے اور موجودہ رجحان یہ ہے کہ الفاظ کو جہاں تک ممکن ہو کھول کر لکھا جائے۔ ہم نے اسی طرح الفاظ کو کھول کر لکھنے کی کوشش کی ہے۔

(۷) اکثر مقامات پر "یاں" کو "یہاں" اور "واں" کو "وہاں" بھی لکھا گیا ہے جبکہ اشعار میں جو صوتی شکل استعمال کی گئی ہے وہ "یاں" اور "واں" ہے ہم نے الفاظ کا صوتی شکل کے مطابق املا درج کیا ہے۔

(۸) پیش کی حرکت ظاہر کرنے کے لئے اکثر واؤ کا استعمال کیا گیا ہے مثلاً اوس (اُس)، اون (اُن)، اودہر (اُدھر) وغیرہ اس قسم کے الفاظ کی صورت میں شعر میں تلفظ کی جو صوتی شکل باندھی گئی ہے املا اسی کے مطابق ہے۔

(۹) بعض الفاظ کا املا مروڑ کر یا تو غلط لکھا گیا ہے یا پھر بعض حروف کا اضافہ کر کے لکھا گیا ہے مثلاً خوروم (خرم میں "و" کا اضافہ)، صوصو (سوسو) وغیرہ

(۱۰) اسی طرح بعض مقامات پر "کے" کے بجائے "کہ" کا استعمال بھی ہوا ہے جیسے جاکہ (جاکے) دل کہ (دل کے) وغیرہ ہم نے اس قسم کے سارے الفاظ کو مروجہ املا کے مطابق لکھا ہے۔

قلمی کتابوں میں املا کی مندرجہ بالا خصوصیات، تدوین متن کے دوران بڑی اُلجھن پیدا کرتی ہیں اور پڑھنے میں کافی دشواری محسوس ہوتی ہے۔ عہد حاضر کے قاری کے لئے قدیم متن کو قابل فہم بنا کر پیش کرنے کے لئے املا کی یہ تصحیح ضروری تھی لیکن بعض الفاظ جن کی قدیم شکل شاعر نے شعر میں باندھی ہے ان میں کوئی تبدیلی کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا مثلاً کیدھر، یاں، وھاں وغیرہ۔

دیوان لطف کے تینوں نسخوں میں اکثر اوراق کرم خوردہ یا آب زدہ ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے حروف برابر پڑھے نہیں جاتے اور اس پر کتابت کی بے شمار غلطیاں تدوین متن کے لئے ایک چیستان بن جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں مختلف نسخوں کی مدد سے متعدد اشعار کی شاعر کے اسلوب بیان اور مزاج کے مطابق تشکیل جدید کی گئی ہے ایسے اشعار جن کی ہم نے دوبارہ تشکیل کی ہے فٹ نوٹ میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

آخر میں میرا یہ خوش گوار اخلاقی فریضہ ہے کہ اُن تمام اصحاب کا شکریہ ادا کروں جنھوں نے کتاب کی تدوین سے لے کر اس کی اشاعت تک مختلف مراحل میں میری مدد فرمائی۔
میں بطورِ خاص محترم پروفیسر غلام عمر خاں صاحب کا ممنون ہوں جنھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اِس کتاب کا پیش لفظ تحریر فرمایا بلکہ مفید مشوروں سے بھی میری رہنمائی کی بعض اشعار کی تشکیل نو، مشکل اور غیر مانوس الفاظ کو کھولنے میں میری مدد فرمائی۔ اگر پروفیسر صاحب موصوف کی خصوصی توجہ، دلچسپی اور گراں قدر رہنمائی حاصل نہ ہوتی تو یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوسکتی تھی۔
پروفیسر رفیعہ سلطانہ صاحبہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد جو میری محترم اُستاذ ہیں کا شکریہ ادا کرنا بھی بہت ضروری ہے جنھوں نے میرے پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقاتی کام کے سلسلہ میں مرزا علی لطف کا موضوع تجویز کیا تھا اور اپنے مفید مشوروں سے بھی مستفید فرمایا۔ طالب علمی سے اب تک ان کی مشفقانہ سرپرستی مجھ کو حاصل رہی ہے۔
ناسپاس گذاری ہوگی اگر میں شفیق و محترم استاد ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب ریڈر اردو، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے بہ حیثیت نگران میرے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ کے لیئے قدم قدم پر رہنمائی فرمائی اور "دیوانِ لطف" کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں اپنے مشفقانہ مشوروں سے سرفراز فرمایا۔
اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں راقم الحروف کو مرزا علی لطف کے تذکرہ گلشنِ ہند کے ساتھ، ساتھ حیدر بخش حیدری کے "گلشنِ ہند" سے استفادہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ حیدری کے مخطوطہ "گلشن ہند" مخزونہ برٹش میوزیم، لندن کی فوٹو کاپی میری بڑی ہمشیرہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ اہلیہ جناب مرزا عبدالکریم بیگ صاحب (حال مقیم لندن) نے بھجوائی ہے ہمشیرہ صاحبہ سے جو تعلقِ خاطر ہے اس کی بناء پر اُن کا شکریہ ادا کرنا محض ایک رسمی بات ہوگی۔

میں اپنے منجھلے ماموں محترم میر کاظم علی مرحوم (حضرت برق موسوی) اور چھوٹی ہمشیرہ محترمہ زہرا بیگم صاحبہ (اہلیہ جناب محمد کاظم حسین صاحب) کا بھی ممنون ہوں جن کے گراں قدر مشورے اور نیک تمنائیں اِس کتاب کی اشاعت میں شامل رہی ہیں۔

میں اُن تمام لائبریرین حضرات کا شکر گزار ہوں جنھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے کتب خانوں سے استفادہ کا موقعہ دیا۔ خاص طور پر میں نے کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، کتب خانہ سالار جنگ میوزیم، اسٹاٹ سی ببلیوتھک جرمنی اور گورنمنٹ سٹی کالج لائبریری سے مواد فراہم کیا ہے۔

میں شعبۂ اردو عثمانیہ یونی ورسٹی میں اپنے رفیقِ کار ڈاکٹر محمد علی اثر صاحب کا بھی شکر گزار ہوں، جنھوں نے "دیوانِ لطف" کی اشاعت کے مختلف مراحل میں میرا ہاتھ بٹایا ہے۔

آخر میں، میں اپنی نصف بہتر کنیزِ سکینہ کا بھی ممنون ہوں جو میرے علمی، ادبی اور تحقیقی کاوشوں میں ہمیشہ معاون رہی ہیں۔

مرزا اکبر علی بیگ

۲/۲-۱-۳۲-۹-۵، حیدر گوڑہ

حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۱، اے پی

۹/اپریل ۱۹۸۳ء

غزلیں

زیبِ لوحِ عرش پیچ مصرع ہے بسم اللہ کا
واہ رے پُر سادہ وپُرکار مصرع آہ کا

لے زمیں سے آسماں تک عشق کو پایا محیط
ہے کتانِ دل چاک تو داغِ جگر ہے ماہ کا

صدقے اُس ٹھوکر کے جس نے کر دیا کرسی نشیں
فی الحقیقت ورنہ کیا رتبہ غبارِ راہ کا

ہو نہ اودھر سے کشش تو ہم ضعیفوں سے ہو کیا
کہربا کے ساتھ وابستہ ہے جلوہ کاہ کا

دیر و کعبہ شیخ و راہب کو مبارک ہوے لطف
بندۂ درگاہ بندہ ہے دلِ آگاہ کا

○

دل کی واشد کے لیے سیرِ چمن کو جائیں کیا
دیکھیں روئے گُل تو اس گلرو کو منہ دکھلائیں کیا[1]

پاسِ ناموسِ محبت فرض ہے پروانہ وار
شمع ساں سوزِ شبِ ہجراں زباں پر لائیں کیا

بلبل و گل میں جو شش ہے سرو قمری میں یہ ربط
گلستانِ دہر میں پھر دل کہیں اُلجھائیں کیا

غیر لبریزِ شکایت ہے میری جانب سے آج
اُن کے مہرے قدرداں اب دیکھیے فرمائیں کیا

دھیان اُس بدمست کا خاطر سے جاتا ہی نہیں
جی نہ لگتا ناصح بھلا پھر آپ میں ہم آئیں کیا

سنتے تھے طوفانِ نوح آنکھوں سے دیکھا وہ تو لطف
دیکھیے یہ چشمِ گریاں اور اب دکھلائیں کیا

---

[1] (ب) ع دیکھیں روے گل اس گلرو کو منہ دکھلائیں کیا

○

بزم میں آنا جوں ہی شب اس کا بیا کانہ تھا
شمع پر جلنے (سے) اپنے منفعل پروانہ تھا

واہ رے کیفیتِ چشم اس کے دیوانے ہیں ہم
آنکھ بھر کر جس طرف دیکھا وہ پھر میخانہ تھا

ہوگئی زنجیرِ پا اپنی یہ زلفِ پُر شکن
ورنہ دل تجھ سے کو دیتا کب کوئی دیوانہ تھا

تھا نہ جب تجھ کو کہانی سننے کا بھی امتیاز
گوش زدِ عالم کے میرا اُن دنوں افسانہ تھا

دشمنی کا دل کی کیا کیجے گلہ ہمدمؔ غرض
آشنا سمجھے تھے ہم جس کو سو وہ بیگانہ تھا

کفر (و) دیں پروانہ مشرب جائیں کیا وہ شعلہ رو
گاہ شمعِ کعبہ تھا گہہ مشعلِ بُت خانہ تھا

کیا ہی لہراتا ہے دل کیفیتیں مجنوں کی سُن
تھا تو دیوانہ عجب عالم کا پر دیوانہ تھا

پوچھ مت بلبل خزاں کا ہو جیو خانہ خراب
آج دیکھا جا کے گلشن کو تو ایک ویرانہ تھا

کیا دل آشفتہ ہوا ہے صحبتِ شب دیکھ کر
بے تکلف دامنِ زلف اور دستِ شانہ تھا

ہم نہ کہتے تھے شریک مے نہ کیجے لطف کو
دیکھیے گا آگے یہ تو پہلا ہی پیمانہ تھا

○

کس کو بہلاتے ہو شیشہ کا گلو ٹوٹ گیا
خُم بھرے منہ سے لگا دے جو سبو ٹوٹ گیا[۱]

کیجیو اُس زلف کو مشاطہ سمجھ کر شانہ
لاکھ دل ٹوٹے اگر ایک وہ مُو ٹوٹ گیا

کچھ خبر ہے تجھے کہتے ہیں ترے زخمی کا
آج پھر چاک کا سینے کے رفو ٹوٹ گیا

---

[۱] عمدہ منتخبہ میں یہ شعر اس طرح ہے
(دیکھئے عمدہ منتخبہ از میر محمد خاں سرور مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ۱۹۶۱ء۔ دہلی صفحہ ۵۵۱)
بس کہ بہلاتے ہو شیشے کا گلو ٹوٹ گیا
خم بھرے منہ سے لگا دو جو سبو ٹوٹ گیا

فلک اس دل شکنی کا تو مزا دیکھے گا
کوئی دل گر کبھی اے عربدہ جو ٹوٹ گیا

تھی مریدوں کے لئے قلب کے صدمے کی دلیل
شیخ کا رقص میں سم پر جو وضو ٹوٹ گیا

دھیان اُس شیشے کا رکھنا کہ نہ ہوگا پیوند
دل مری جان اگر یک سرِ مُو ٹوٹ گیا

اُس خود آرا کے رہا ہاتھ میں نت آئینہ
غم سے آئینۂ دل ہائے نہ تو ٹوٹ گیا

محتسب نے تو خرابات میں کی خوں ریزی
پر ہر رند پہ شبِ مے کا کدو ٹوٹ گیا

دیکھنا تارِ محبت کہ ہے مشکل پھر سانٹھنا[1]
رشتۂ دوستی اے لطفؔ کبھو ٹوٹ گیا

○
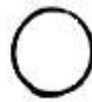
خدا ہی جانے رہا یا نہ امتیاز رہا
اُدھر تو ناز رہا اور اِدھر نیاز رہا

یہی تو کفر ہے یارانِ بیخودی کے حضور
جو کفر و دیں کا مرے یار امتیاز رہا

نہ ہووے خرمنِ پروانہ کیوں کہ موردِ برق
زبانِ شمع پہ تا صبح سوز و ساز رہا

غرورِ حسن وہ آفت حیائے عشق یہ قہر
غضب ہوا وہ اگر یوں ہی محوِ ناز رہا

پڑھا یا قصۂ سنبل صبا نے حد لیکن
فسانہ زلف کا تیری بہت دراز رہا

نہیں سمندر و پروانہ پر وہ آفت ہوں[2]
کہ جس کے نام سے آتش کو احتراز رہا

نہ پہنچی ضعف سے لب تک دعا ہی ورنہ سدا
درِ قبول تو اس آرزو میں باز رہا[3]

---

[1] دیکھ پھر تارِ محبت کی گرہ مشکل ہے ــــــ (مجمع الانتخاب ۱۶۸ ب)

[2] [illegible] سمندر و پروانہ پہ وہ آتش ہوں۔ (بہارِ بےخزاں مولف احمد حسین سحر مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد صفحہ ۸۳۔)

[3] درِ قبول تو اس آرزو میں وا ہی رہا ــــــ (گلستانِ بےخزاں از قطب الدین باطن صفحہ ۲۰۲)

یہ سحر تھا کہ فسانہ تمام شب ہمدم — ہر استخوانِ بدن یکقلم گداز رہا

بدل کے قافیہ کہہ اور اک غزل اے لطفؔ
بس اس زمیں میں قیامت سخن طراز رہا

○

چمن کو کل جو تری میکشی کا دھیان رہا — ہر ایک پات کے کھڑکے پہ گل کا کان رہا
رہا جو زندۂ شب تیرۂ فراق یہ قیس — سیاہ خیمۂ لیلیٰ کا اُس کو دھیان رہا
جو عمر خضر ہو شاید تو وصل ہووے نصیب — یہ زندگی جو تھی اس میں تو امتحان رہا
نہ آنکھ بھر کے کبھی ڈر سے ہم تو دیکھ سکے — وہ سامنے بھی اگر اپنے ایک آن رہا
کوئی جو ہو میرے قاتل کو اور ہے اک زخم — کہ اس ہوس میں یہ بسمل ہی نیم جان رہا
طواف گاہ بگولوں کا ہوگا بعدِ وفات — ہماری خاک سے کچھ بھی اگر نشان رہا
جرس کو دیویں تو تعلیمِ نالہ ہم لیکن — ابھی سلگ کے نہیں بس یہ کاروان رہا

کہاں پھنسا دیا دل لطفؔ تو نے اے ظالم
امان مانگت جس سے کہ اک جہان رہا

○

کون سی شب نہ قلق سے یہاں مرجاتا تھا — نہ اُدھر آنا اُسے پر نہ اِدھر آتا تھا
کیا کہیں بھولے ہم اے ناصحِ مشفق یکبار — تمہیں اُس آفت دیں کے تئیں دکھلاتا تھا

بارہا چاکِ گریباں کو سیا یاروں نے
چاک کو دل کے بھی اک بار تو سلواتا تھا

○

کشورِ دل تو سدا کا نہیں ویرانہ تھا
یہ خرابہ بھی کسی وقت پری خانہ تھا[1]

دیکھا اے شیخ وبراہمن کہ جسے کہتے ہیں دل
یہی کعبہ تھا کبھی اور کبھی بت خانہ تھا

خرمنِ صبر کے اپنے تو ہوا برق وہ خال
مزرعۂ حسن میں کہنے کو جو اک دانہ تھا

حسنِ مژگاں سے کیا اس نے تو شعلہ کا کام
کس جگرِ سوختہ کا ہم نشیں افسانہ تھا

بعد مجنوں کے غنیمت تھا بہت لطف بھی ہائے
اس کی وحشت میں بھی آباد تو ویرانہ تھا

○
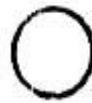
نہ چاک سینے میں جب تک ہوں لاکھا پیدا
برنگِ صبح کہاں ہو دمِ صفا پیدا

اگر ہو تنگ دلی پہ برنگِ غنچہ صبور
گرہ سے ہو نہ رہے ابھی گرہ کشا پیدا

مدد اے خضرِ عنایت کہ تو سفر میں ہم
نہیں ہے راہِ عدم میں تو نقشِ پا پیدا

چمک زیادہ ہوئی حسن کی خط آنے سے
غبار سے کی اس آئینہ نے جلا پیدا

خدا کے واسطے پنہاں کر اس کفِ پا کو
کہ ہے اور ابھی رنگ یہ حنا پیدا

کہیں تو قافلہ ٹھہرے سینہ چاکوں کا
نہیں ہے اب جرسِ دل کی کچھ صدا پیدا

کیا جو میرا سا نالہ تو کیا تکلف ہے
مرا سا ہو تو قمری کرے بھلا پیدا

جسے کہ کہتے ہیں عنقا سو ہے یہ ایما لطف
کہ دہر میں نہیں ہوتا ہے آشنا پیدا

---

[1] یہ شعر طبقات الشعراء از قدرت اللہ شوق مرتبہ نثار احمد فاروقی میں اس طرح ہے دیکھیے صفحہ ۳۲۳)

ع کشورِ دل تو سدا کا نہ ویرانہ تھا
یہ خرابہ بھی اک عالم میں پری خانہ تھا

○

نہ زُلف کا ہر مو ہو ترے بیاں پیدا
بسانِ شانہ اگر کیجئے سوز باں پیدا

غنیمت اے ستم ایجاد آج لطف کو جان
کہ ایسے گم شدہ ہوتے ہیں پھر کہاں پیدا

○

ہوں کشتۂ حسنِ سبز کے میں رنگ ڈھنگ کا
لوحِ مزار کیجو زمرد کے سنگ کا

خونِ دل آ کے آنکھوں میں ہو جاتا ہے سیاہ
یارب ہے دھیان چشم کو کس سبزہ رنگ کا

مشتاق اک نگاہ کے ہونٹوں پہ جان ہے
ظالم پہنچ کہ وقت نہیں آب و رنگ کا

ہے اپنی سوچ سے مجھے ہمدم ہمیشہ ہجر
خامے سے پائے بستہ ہوں نام اور ننگ کا

قدرت خدا کی غیر سے خواہش ہو صلح کی
ہم سے ہر ایک بات پہ پیغام جنگ کا

واں تجھ کو خواب ناز ہے یاں ہم کو صبح تک
جنبش پلک کی دل میں ہے پیکان خدنگ کا

ہر نالہ لطف آج تو پوچھو نکے ہے کارواں
کوئی دل شکستہ ہے دمساز رنگ کا

○

کون سا خلطانہ تم کو ایک عالم سے رہا
ایک عالم کا تکلف ہاں مگر ہم سے رہا

پائی داماں گل کی کھانہ اے بلبل قسم
رات بھر سرشار کیفیت میں شبنم سے رہا

چھلک گیا ایسا ہی کیفیت سے ان آنکھوں کی ہو
حشر تک تو بے غم اب فکر دو عالم سے رہا

واہ رے ہمت سفالِ کہنہ جامے جام ہے
یہ بساط اور ننگ نت ہم چشمی جم سے رہا

دیدۂ یعقوب نابینا ہو یوسف کے لیے
تن میں تیری اے زلیخا جان اس غم سے رہا

رابطہ جس ناسور کو آغوشِ مرہم سے رہا | چاشنی سے درد کی واقف ہوا وہ زخمِ چاک

کتنا آوارہ ہے وہ بد وضع عالم آشنا
لطفؔ کینہ تجھ کو ناحق ایک عالم سے رہا

○

لاکھا ہے گل صبا سے کھلا اب کے باغ کا | چھاپا نہ سر کا آہ سے اک دل کے داغ کا
ہے کون سبز رنگ خراماں کہ رشک سے | جوں شمع سبز جلتا ہے ہر سرو باغ کا
ٹھوکر سے بھی کیا نہ کبھی اس نے سرفراز | ہوں کشتہ لاکھ جان سے میں اس دماغ کا
ساقی لگا دے خم میرے منہ سے کہ بار بار | احسان کون کھینچے سبو اور ایاغ کا
کب ہم شکستہ پاؤں کو بو اس کی ہو نصیب | جس گل کے ہو صبا کو تجسس سراغ کا
جی پر یہ کھیلنا ہے جہاں دیکھا شعلہ رو | یارب یہ دل ہے یا کہ پتنگا چراغ کا

مت لطفؔ سے بیاں کر اے شیخ رد سیاہ[1]
شاہین بھی ہوا ہے کہیں صید زاغ کا

○

ایک دن حالِ دلِ زار نہ دیکھا نہ سنا | سچ یہ تجھ سا ہے دل آزار نہ دیکھا نہ سنا[2]
دیکھ کل نبض مری رو کے لگا کہنے طبیب | کبھی میں نے تو یہ آزار نہ دیکھا نہ سنا

---

[1] (ب) ع مت لطف سے ۔۔ کر اے شیخ رو سیاہ
[2] ۔ ع سچ تو یہ تجھ سا بھی دلدار نہ دیکھا نہ سنا ۔ (گلشن بے خار صفحہ ۱۲۷)
یہ مصرع تذکرہ "یادگار ضیغم" (قلمی) میں بھی بالکل اسی طرح ملتا ہے ۔ (مخطوطہ یادگار ضیغم ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد صفحہ ۵۵۲)

وہ مجھے تم نے دکھایا ہے کہ یعقوب نے جو
کبھی اے دیدۂ خونبار نہ دیکھا نہ سُنا

لختِ دل کرتا ہے کیا کیا صفِ مژگاں پہ نمود
اس جواں سا بھی نمودار نہ دیکھا نہ سُنا

چشم اور گوش زمانہ ہیں مقر اس کے لطف
ثانیٔ حیدرؑ کرّار نہ دیکھا نہ سُنا

تصوّر میں اُس انداز آفریں کے دل جو بھر آیا
سرِ مژگاں پہ کس جھمکے سے ہے لختِ جگر آیا

ہم اور فرہاد بحرِ عشق میں باہم ہی کودے تھے
جو اس کے سر سے گزرا آب میری تا کمر آیا

شب آیا تو نصیحت کر کے افسوسوں سے میں لیکن
گلی سے اُس پری کے مثلِ سایہ بے خبر آیا

کنارو جیب میرا ہی فقط اے کاش تر رہتا
جہاں اس چشم دریا جوش کے ہاتھوں سے تر آیا

جوابِ نامہ کی کیفیت اس مضمون سے ظاہر ہے
کہ اودھر سے کبوتر مضغۂ بے بال و پر آیا

سُنا کرتے تھے شہرہ لطف کا مدت سے کل دیکھا
جوانِ کم سخن دارستہ خاطر سا نظر آیا

سرشک آتا تھا ہمدم کل تلک تو آہ رنگیں سا
گریباں آج لختِ دل سے ہے دامانِ گلچیں سا

دکھا دیں بے ستونِ چرخ کا عالم تجھے فرہاد
جو مل جاوے ہمیں بھی کارفرما کوئی شیریں سا

ہزاروں رنگ سے ہے جلوہ فرما وہ بت اے زاہد
نہ میر الکعبہ دل کیوں کہ ہو بت خانۂ چیں سا

جلانا فرض ہے اے شیخ اس دلقِ ملمع کا
نہ لے اک جام پر جس کو مغان ہمت آئیں سا

عجب شورِ قیامت تھا اسے کل دیکھ توسن پر
جہاں فتنہ برانگیز ہو تو خانۂ زیں سا

نہیں وہ ہم کہ کہنے سے تیرے ہر بت کے بندے ہوں[1]
کرے پیدا ابھی گر ناصح تو اس غارت گر دیں سا[2]

خدا نا کردہ کیا دل تو گنوا بیٹھا نہیں ظالم
نظر آتا ہے کچھ تو ان دنوں اے لطف غمگیں سا

○

بہنے سے ایک پل بھی نہیں اشک رہ گیا
دل ہو کے آب کیا بھلا آنکھوں سے بہہ گیا[3]

ہر یک نے تن پہ چاک کفن جوں کتاں کیا
تربت پہ کشتگان کی جو اپنی وہ گیا (کذا)

تیغِ نگاہ کے خوف سے کل اس کے روبرو
جوہر کے آئینہ سے بہن کر زرہ گیا

بھولے سے آگیا جو مری خاک پر وہ شوخ
جو جو کچھ اس کے شوق میں آیا سو کہہ گیا

بس اب ذرا سمجھ کہ رہے مجھ سے گفتگو
کیا کیا سمجھ تو میں تیری باتیں ہوں سہہ گیا

اے خضرِ راہ گم شدگاں وقت لطف ہے
آگے گئے ہیں یار میں پیچھے ہوں رہ گیا

---

[1] (ب) — نہیں وہ ہم کہ کہنے سے تیرے ہر سنگ کے بندے ہوں
کوئی پیدا ابھی کر ناصح تو اس غارت گر دیں سا

[2] (ج)۔ نہیں وہ ہم کہ کہنے سے تیری تربت کے بندے ہوں کرے پیدا ابھی گر ناصح تو اس غارت گر دیں سا

[3] ۔ اس شعر کی از سر نو تشکیل کی گئی ہے۔

○
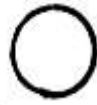
ہم سے ہی اگر وہ مہ تاباں چھپے گا[1] — بلبل سے بھی تو گل خنداں چھپے گا (کذا)

مرتا ہوں ہوا داریٔ مشاطہ پہ میں تو[2] — برقع میں وہ کب مہر درخشاں چھپے گا

گر قتل کیا ہے (تو) کوئی بات بنا رکھ

یہ لطف کا خوں ہے نہ میری جان چھپے گا

○
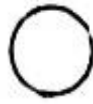
جس کے لیے جہاں سے (میں) یکسر بگڑ گیا — باتوں میں صاف مجھ سے وہ کافر بگڑ گیا

جس دن اٹھایا خانۂ گردوں سے بستر ا — دیکھو گے آسماں کا بنا گھر بگڑ گیا

نت طفلِ اشک رکھتا ہے جیب و کنار تر

لطف ان دنوں کمال یہ ابتر بگڑ گیا

○

کل سے اے مہ ہوں تجھے وابستۂ غم دیکھتا — خیر تو ہے آج کچھ آنکھیں بھی ہوں نم دیکھتا

اے مکتب کا نشاں ہے یہ تو اے مکتب نشیں — کچھ ترا سیپارۂ دل ہوں میں برہم دیکھتا

آشنا کس سے ہوا جو اے محبت بیگانہ خو — مہر ہوں تیرا آشنا ہر زانوے غم دیکھتا

تھا فریب وعدہ پر تیرے بھی میرا ہے یہ حال — تو صدائے در پہ ہے جس طرح ہر دم دیکھتا

حال تیرا کچھ کئی دن سے ترے کاکل کی طرح — اے پریشاں ساز جمعیت ہوں درہم دیکھتا

یہ بھی قدرت ہے خدا کی میرے عالم کو اب — وہ کہتے تھے آپ کا ہوں اب وہ عالم دیکھتا (کذا)

نسخہ (ا) ع ہم سے بھی تو تو گل خنداں چھپے گا ۔ [2] (ا) مرتا ہوں ہواداری میں تو (کذا)

کربلا کا واقعہ جب سے سُنا ہے تو نے لطفؔ
ہوں تیری ہر شب کو میں ماہِ محرّم دیکھتا[۱]

○

ہے اِس شدت سے رنگینیٔ کوئے یار کا چرچا
کہ بھولا عندلیبوں کو گل و گلزار کا چرچا

ڈھکا رہ جائے اسرارِ محبت تو غنیمت ہے
ہوا ہے اب حکیموں میں میرے آزار کا چرچا

برنگِ پیکرِ تصویر رہتا ہوں سدا سالک
ہے اِس پر اس کی محفل (میں) میری گفتار کا چرچا

ہمیں ہے یار کے چرچے سے یہ فرصت کہاں ہمدم
کہ اب دن رات بیٹھے کیجیئے اغیار کا چرچا

بیانِ دردِ دل کس لطف سے کرتے ہزار افسوس
جو ہوتا بزم میں اس کی کبھی اشعار کا چرچا

○

گماں اپنا صواب اندیش دہر تا پا خطا نکلا
جسے اہلِ وفا سمجھے تھے ہم وہ بے وفا نکلا

خدا سے ہو گئے بیگانہ حسن کی آشنائی میں
مسلماں تو غضب یہ ہے وہ بُت نا آشنا نکلا

مقرر تھا اک جہاں میں سرمہ آلودہ دغا دہ چشم
ذرا تھی دیدہ بینائی کی بالکل طوطیا نکلا

نہ بے غفلت کہ ہم دنیا کو بزمِ عیش سمجھے تھے
کھلی جب چشمِ حقیقت بیں تو کامِ اژدہا نکلا

نہ کر اے لطفؔ ناحق رہرو اِن دیر سے حجت
یہی رستہ تو تھا کر پھیر ہے کعبہ کو جا نکلا

---

۱ (ب) سنا ہوں ترے ہر سال کو ماہ محرم دیکھتا۔

○

جس سے میں گرسنۂ وصل اپنا سمجھوں تھا — ذرا جو غور کیا صاف تشنۂ خوں تھا
میرے گماں میں جو تھا سروِ گلشنِ لیلیٰ — جو خوب غور سے دیکھا تو بیدِ مجنوں تھا
غضب تو دیکھو وہ نکلا جوار کا دانہ — جو میرے زعم میں برسوں سے دُرِّ مکنوں تھا

یہ ہے سمجھ تو پڑے پتھر اس سمجھ پر (لطف)
جسے سمجھتا تھا یاقوت قطرۂ خوں تھا

○

اُڑا کیوں رنگ ہے چہرے کا یہ فرمایئے صاحب — گنوا بیٹھے کہیں دل بس نہ اب شرمایئے صاحب
کہیں آنسو کے پی جانے سے چھپ سکتا ہے دردِ دل — اس آہِ سرد کا باعث تو کچھ بتلایئے صاحب
یہ سو سو بار دل میں ایسے بیکل رہو کہاں جاتے — اُدھر تو آیئے صاحب اِدھر تو آیئے صاحب
مجھے کہتے تھے ضبطِ نالہ تجھ سے ہو نہیں سکتا — اب آپ اک آہ تو دیکھیں نہ لب تک لایئے صاحب
غضب ہوگا وہ اِس آفت میں جس نے تجھ کو ڈالا ہے — ہمیں بھی اس بلائے جاں کو ٹک دکھلایئے صاحب
گیا گذرا وہ بس اٹھکھیلیوں سے خوش نہیں ہوتا — مری ہی طرح اب بیٹھے ہوئے غم کھایئے صاحب

ہمیشہ لطف کو کہتے تھے اپنے دل کو سمجھا تو
ذرا اب آپ دل کو اپنے تو سمجھایئے صاحب

○

ازبس نہ ہوا ہم سے سر انجامِ محبت — شرماتا ہے دل لیتے ہوئے نامِ محبت
فرہاد سا نہ رنگ نہ مجنوں سا کیا حال — کس منہ سے اسے بھیجیے پیغامِ محبت

پروانہ سے شب کہتی تھی باسوزِ جگر شمع
لے کر مزا جل ذرا اے خامِ محبت
ہے کیشِ محبت میں حرام اس پہ غمِ دوست
جو سمجھا حلال آپ پہ آرامِ محبت
کل لطفؔ کی مرقد پہ گیے ہم تو نہ خاک
اس شعر کو پڑھتا تھا وہ ناکامِ محبت

○

اے اہلِ محبت کوئی بھولے سے بھی ہرگز
لینا نہ خبردار کبھی نامِ محبت
آغازِ محبت نے جو دکھلایا سو دیکھا
کیا دیکھیں دکھاتا ہے اب انجامِ محبت
زاہد ہے یہ آرائشِ خال و شکنِ زلف
کافی میرے پھنس جانے کو ہے دامِ محبت
کیوں لطفؔ میاں جیتے ہو بن یار کے دیکھے
اے ننگِ محبت تو نہ لے نامِ محبت

○

او بیوفا اڑائی یہ کس سے جفا کی طرح
سو رنگ سے جفا کو دکھاتا وفا کی طرح
چتون میں سو شرارتیں اور پشت پا پہ چشم
اس شوخ کی ہیں تو خوش آئی حیا کی طرح
مانا کہ قلبِ یار ہے آہن پہ جذبِ عشق
کامل ہو گر تو کھینچ لے آہن رُبا کی طرح
(رنگ) حنائی اُس کفِ پا سے نہ پوچھیے
ہو دست رس ہمیں بھی جو رنگِ حنا کی طرح

سہ (ا) شکِ حنائی اس کفِ پا سے نہ پوچھیے

ہوتے ہیں بعدِ قتل طلب گارِ حق بھی
ملکِ بتاں میں دیکھ یہ شے خوں بہا کی طرح[1]

کیا کم ہے سلطنت سے سگِ کوئے یار اگر
قانع ہو استخواں پہ ہمارے ہما کی طرح

ہر صبح گھر سے دیتی ہے یادِ وطن نکال
غربت میں عمر کٹ گئی گو ہیں صبا کی طرح

اور اک غزل میں لطفِ معانی کی کر تلاش
دیکھیں تو بارے ہم تیری طبعِ رسا کی طرح

○

یہ ہے ستم کی طرز اگر اور جفا کی طرح
ڈالیں گے سر فرش ہی تو یاں وفا کی طرح

جلتے ہیں مثلِ شمع مزا لے لے اہلِ دل
پروانہ جل سکے ہے کب اہلِ وفا کی طرح

دور از حیا ہے اس حرکت اور سکون پہ ناز
پابندِ دست غیر جو ہو دے عصا کی طرح

ہم کیوں کہ ننگِ کافر و دیں دار ہوں گے آہ
پوجا ہے سالہا تجھے اے بت خدا کی طرح

جامہ کفن ہوا تنِ دشمن میں دیکھ کر
ہاتھ اپنے بر میں دوست کے بند قبا کی طرح

ہوتے ہیں بارِ خاطرِ احباب کب وہ لوگ
کھٹکے کے ساتھ جائیں جو گوسوں صدا کی طرح

---

[1] (ب) ع ملکِ بتاں میں دیکھی ہے خوں بہا کی طرح

نازک مزاجی جان یہ لائی کہ جیوں سرشک
پیسے ہے ہم کو گردشِ چشمِ آسیا کی طرح

اللہ رے وفورِ تحیر کہ اہلِ دید
کوچے میں اس کے بیٹھ گئے نقشِ پا کی طرح

ہے استخوانِ سوختہ دنیائے سگ فریب
کب صیدِ دامِ حرص ہو دانا ہما کی طرح

کیا بد مذاقیاں ہیں کہ یارانِ چشم پوش
شربت کا ہووے گھونٹ تو پیویں دوا کی طرح

سوالمزاج کیوں نہ زمانے کو ہوئے لطف
قانونِ دہر سے گئے یکسر شفا کی طرح

○

خجل ہم کو ہوا صیاد کر بند
قفس میں پائی جب اک مشتِ پر بند

کہاں سوزِ دروں ہے گرمیٔ خون
نہ جب تک کر دے نوکِ نیشتر بند

رگِ جاں ہے وہاں مشاطہ ہر تار
غضب ہے اس کا لوٹا کوئی گر بند

نہ ہو گر الفتِ صیاد مانع
چمن تک آج ہم جاتے ہیں پر بند

فزوں غربت میں خوش طینت کا ہو وقر
صدف میں ہی نہیں دیکھو گہر بند

لچکتی ہے کمر اُس نازنیں کی
کرے گر رشتۂ جاں سے کمر بند

پھنسا دامِ نگہ میں اس کی دل جا
جن آنکھوں کا ہے اک عالم نظر بند[1]

مبارک لطفِ آوارہ کے ہاتھوں
ہیں اب تو رہ گزر کے رہ گزر بند

---

[1] یہ شعر صرف "تذکرہ طبقات الشعراء" از قدرت اللہ شوق (قلمی) کتب خانہ عمر یافعی۔ حیدرآباد میں ہے

○

لے ہم سے اک نگاہ پہ گردہ نگار دل — واللہ دل سے دیجیئے بے اختیار دل

جیب سے گرفتہ آہ ہوا غنچہ وار دل — دیکھا نہ پھر شگفتہ کبھو ایک بار دل

صید افگنی کی طرح سے جو آشنا نہیں — کیا تیر ہے کہ اس کا ہوا ہے شکار دل

تو جتنا بیقرار ہے اتنا دہ بُرد بار — صحبت خدا کرے تیری ہوئے بار دل

اس کے جلے ہوؤں کی یہ تربت کا ہے نشاں — جلتا ہے واں بجائے چراغِ مزار دل

دیوے گا زیر خاک بھی آرام خاک لطف
پہلو میں یوں ہی گر رہا یہ بے قرار دل

○

مطلق نہیں ہے تجھ کو خیالِ دعائے دل — ہوتا بلائے جاں تو کاش اے بلائے دل

یہ سختیاں تو دل کا نہیں کام کیا عجب — گر سنگ تیرے سینہ میں ہووے بجائے دل

ہر آہ مثلِ عمز دگاں ہے سیاہ پوش — سینہ میں آج (آہ) مگر ہے عزائے دل

تجھ کو تو اک نگاہ پہ دیویں جو لیوے تو — ہر چند دو جہاں بھی نہیں ہے بہائے دل

ایسی غزل یہ لطف کوئی کہتا ہے غزل
گہہ زور آزمائی ہے گر مدعائے دل

○

ہر اک کہے ہے مجھ سے کہو ماجرائے دل — رسوا کیا جہاں میں مجھے تو نے ہائے دل

ہر شام تا بہ صبح یہ آوازِ جان گسل — اک شور اس کے کوچے میں ہے ہائے ہائے دل

تیری جفا تو سچ ہے کہ اس میں بھی کچھ ہے جھوٹ
ہم نے کیا قبول غلط ہے وفائے دل

بندہ کیا ہے اک بتِ بدکیش کا مجھے
فریاد دل کے ہاتھ سے ہے لے خدائے دل

راضی کر آج مجھ کو نہیں ہوگا کل خجل
ظالم نہیں ہے جانِ جہاں خوں بہائے دل

یک آشنائے با مزہ صد عالم آشنا است
بیگانہ دو جہان سے ہیں آشنائے دل

آئینہ دار نورِ جمالِ علی ہو لطف
منظور تجھ کو یار اگر ہے صفائے دل

○
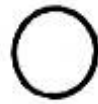
سنا ہے دشمنِ جاں دوست و کسی کا دل
یہ قہر دیکھو کہ دشمن ہے میرے جی کا دل

ہوا ہے اب تو یہاں تک یہ مجھ سے بیگانہ
کہ آشنا بھی کبھی تو نہ تھا کسی کا دل

گر اک نگاہ یہ سمجھے گراں تو خوش رہیئے
گرا پڑا نہیں ایسا یہاں کسی کا دل

نہ دیکھے روئے صفائے ہمارا آئینہ
ہوس جو رکھتا ہوگا ہے سکندری کا دل

جلا ہوں رات عجب بیکسی کے عالم میں
کہ بیکسی پہ جلا میری بیکسی کا دل

بچا تا کیوں کہ سنا سائی پہ دل اس سے لطف
جو چھین لیتا ہے باتوں میں اجنبی کا دل

○

کیونکر نہ بھلا ہمدم ہو زندگی اب مشکل
ہیں دل میں تو سو باتیں اور جنبش لب مشکل

اک آہ کے کہنے کو سو چاہئیں تمہیدیں
کس سے کہیں حالِ دل ہے آہ عجب مشکل

دو لاکھ بہلنے ہوں تب روئیے دو آنسو
دو دن کا ہوا جینا ہم کو تو غضب مشکل

کس طرح کوئی رو کر واں دل کو کرے خالی
ٹھنڈی سی جہاں بھرنی اک سانس ہو جب مشکل

مُنہ ضبط جو تر کیجئے تو مارے ہیں شب چشمک
پھر آہ و فغاں ہووے کس طرح عجب مشکل

ہے ضبطِ نفس سے یاں دل خوں ہوا پہلو میں
اے کوہ کن و مجنوں تھی تم پہ یہ کب مشکل

ہم بخت سیاہوں کو دن رات مساوی ہے
ہے شب سے تو مشکل روز اور روز سے شب مشکل

مر جائیں تو چھوٹ جائیں اس روز کے مرنے سے
پر کیا کریں ہے یاں تو مرنے کا ہی ڈھب مشکل

کس طرح اسے ڈھونڈیں مانع ہے حیا اے لطف
اللہ کرے آساں ہے راہِ طلب مشکل

○

کہتے ہیں ختم لعل پہ یہ سنگ رنگ ڈھنگ
کب ہے تیری کلک (سے) بپا سنگ رنگ ڈھنگ

انصاف کر بھلا نہ جلوں کیونکہ رشک سے
ہنس کے لعل میں تجھ کو لیے تنگ رنگ ڈھنگ

وہ لطف اب رکھے ہے میرا گو ہر سخن
آگے ہے حسن کے لعل کا بے رنگ رنگ ڈھنگ

○

شمع نازاں ہے فقط سر سے بھڑک جانے میں آگ
پھونک دے سارا جہاں ہے گی وہ پروانہ میں آگ

شعلۂ شمعِ حرم حُسنِ بُتاں سے ہے خجل
مجھ کو خطرہ ہے کہ لگ جائے نہ بت خانے میں آگ
دیکھنا گرمی کی خوبی میری باری آئے جب
جل مئے ساقی نے بھر دی میرے پیمانے میں آگ
شیخ کی سُمرن شماری میں کوئی گرمی نہیں
چشمِ بینا ہو تو ظاہر ہے ہر اک دانے میں آگ
آتشیں نالے وہ مجنوں کے مجھے آتے ہیں یاد
دیکھتا ہوں جو کہیں دہکے ہے ویرانے میں آگ
بے دماغی ہے بجا اس کے فسانے سے مری
خواب کیا لاوے وہ پنہاں ہو جس افسانے میں آگ
کب ہنسا تھا میں بھلا جلنے پہ پروانے کے لطف
دفعتاً پھونکی مری جلائے گی جو کاشانے میں آگ

○

ہیں بگڑتے ان دنوں اغیار ہم سے ہر طرف
آپ کے یہ منہ لگانے سے تکلف برطرف
خط نے آتے ہی عجب مضموں سمجھایا یار کو
عشق کی جو دستخطی تھی یک قلم سب برطرف
بیٹھ کر مسجد میں رندوں سے نہ اتنا بگڑیئے
شیخ جی آتے ہو میخانے کے بھی اکثر طرف

سچ کہوں دل تو نہیں پر جان تو کر گزروں نیاز
آیئے اس لطف سے بے خانماں کے گھر طرف

○

تیرے آگے یارِ نو یارِ کہن دونوں ہیں ایک
زاغِ زشت اور طوطیٔ شکر شکن دونوں ہیں ایک
میں سیہ بخت اور رقیبِ روسیاہ ہم رنگ ہیں
قیر تیرے پاس اور مشکِ ختن دونوں ہیں ایک
لغمہ کش کیا داستاں اپنی سنائے واں جہاں
صورتِ بلبل اور فریادِ زغن دونوں ہیں ایک
ہو رقیبِ مردہ شوپر وہ نہ کیوں روشن بیاں
یاں چراغِ گور و شمعِ انجمن دونوں ہیں ایک
لطف کی آزاد وضعی سے مزا کیا خاک اٹھائیں
یاں زقومِ دوزخ و سروِ چمن دونوں ہیں ایک

○

بے نیازوں سے کرے جم جو طلب جام کے دام
دیں نہ واللہ وہ جھوٹے بھی کبھی خام کے دام
قیس سا ہو تو رکھے عشق کے بازار میں پانو
یوں لب تنگ و حیا ہو تو اٹھیں نام کے دام

ہے ہمیں اُنس اسیری سے نہ ہوں گے آزاد
جاں تک دیویں گے صیاد تجھے دام کے دام

اب تو یہ اُنس ہے غم سے ترے سودائی کو
نہ لگاویں کبھی کہنے کو بھی آرام کے دام

اس کی گرمیٔ ملاقات پہ مت بھولیو لطف
پھیلے مشہور ہیں یہ اُس بتِ خودکام کے دام

○

یہ زُلف ہے یا قہر کی شب کچھ نہیں معلوم
مکھڑا ہے یہ یا روزِ غضب کچھ نہیں معلوم[1]

تھا روز کو ترے بیمار جنوں تو (کذا)
کیا جانیئے کیوں کٹ گئی شب کچھ نہیں معلوم

اے ہم قفساں کوئی تو صیاد سے کہدو
مدت ہوئی حال چمن اب کچھ نہیں معلوم

معلوم بھی کچھ ہے میں گرفتا رہوں تب کا
تھا نازو ادا آپ کو جب کچھ نہیں معلوم

---

[1] مخطوطہ سالار جنگ میوزیم و مجلہ عثمانیہ میں یہ شعر نہیں ہے۔ جبکہ مجموعہ نغز میں اس طرح ملتا ہے۔

وہ زلف ہے یا قہر کی شب کچھ نہیں معلوم
مکھڑا ہے الہٰی کہ غضب کچھ نہیں معلوم

(محمود شیرانی مجموعہ نغز مطبوعہ صفحہ ۱۴۸

ہے یہ بھی نئی چھیڑ شبِ وصل میں سو بار[1]
پوچھے ہیں وہ کتنی رہی شب کچھ نہیں معلوم
خاموشی کو بھی لطف کی افسوں ہی سمجھنا
گو اس کو لگا لینے کا ڈھب کچھ نہیں معلوم

○

اس عشق کی دولت نہ فقط جاں سے گیے ہم
دل سے گیئے دیں سے گئے ایماں سے گیئے ہم
گو جاں سے گیئے ہم تو نہیں جان کا کچھ غم
صد شکر نہیں خاطر جاناں سے گیے ہم
اُس زُلف نے کافر کیا اور رُخ نے مسلماں
دل دے کے غرض گبر و مسلماں سے گیے ہم
اس رنگ سے گر فصلِ بہار آئی تو اب کے
ہاتھوں سے جنوں تیرے گریباں سے گیے ہم
شورِ زغن و زاغ یہی ہے جو چمن میں
تو نغمہ سرا یانِ چمن یاں سے گیے ہم
ہے لطف علی قوتِ بازو سے ضعیفاں
ہر مور کہے کیوں نہ سلیماں سے گئے ہم

---

[1] یہ بھی ہے نئی چھیڑ کہ اُٹھ وصل میں سو بار
مجموعہ نغز۔ صفحہ ۱۴۸

یاروں نے یہ تو (کہیے) کیا کیا سجھائیاں ہیں
بے وجہ تو نہیں یہ ہم سے رکھائیاں ہیں
میں کیا ہوں باختہ رنگ اُس شعلہ رو کے آگے
مہتاب رو کے منہ پر چھٹتی ہوائیاں ہیں

اک جوئے شیر بدلے اے آفریں ہے فرہاد
کیا بے ستوں میں خوں کی نہریں بہائیاں ہیں
کب غنچۂ دل اپنا واشد صبا ہو تجھ سے
تو سیکڑوں گلوں کی عقدہ کشائیاں ہیں

روئے غبارِ خط و آئینہ رو تو دیکھیے
ہر خط میں دیکھنا پھر کیسی صفائیاں ہیں
طاقت حباب ساں اک نظارے کی نہیں ہے
اِن فرصتوں پہ ظالم یہ خود نمائیاں ہیں
کعبہ سے ہم نہ واقف نے بت کدے سے آگاہ
یاں آستانِ دل ہے اور جبہہ سائیاں ہیں
کیا کام خاک سے تھا نرگس کو چرخِ پُرخم
مٹی میں انکھڑیاں یہ کس کی ملائیاں ہیں
اُس قد کا سرو سے ذکر چھوٹا منہ اور بڑی بات (کذا)
غنچے کے دل میں بے ڈھب باتیں سمائیاں ہیں
اے لطف اس غزل پہ کہنا بقول سودا
یہ عاشقی نہیں ہے زور آزمائیاں ہیں

○

آپ تو بات میں بگڑتے ہیں — واہ کیا منہ سے پھول جھڑتے ہیں

کس کی بیتی بلا جو جانتے ہم — دے کے دل اس بلائیں پڑتے ہیں

ہم تو مرتے ہیں اپنی رنجش پر — آپ ہی منتے آپ ہی لڑتے ہیں

دوست کرتے ہیں دشمنی مجھ سے — دستِ قاتل عبث پکڑتے ہیں

او میاں تیغ والے اور اک زخم — کب سے ہم ایڑیاں رگڑتے ہیں[50]

برگِ گل جس نمط خزاں میں جھڑیں — لختِ دل یوں مژہ سے جھڑتے ہیں

بس غمِ یار اب نبڑ جلدی — نہیں تو یار ہم نبڑتے ہیں

کچھ تو ہے اس خزانے میں کہ بتاں — نقدِ جاں چھوڑ دل پہ اڑتے ہیں

طرفہ دیکھی ہے رسم صیاد کی — مرغِ بسمل کے پر کترتے ہیں[51]

ہم نشیں زخم دل کے کچھ ٹانکے — آج پھر خود بخود ادھڑتے ہیں

جا کے ٹک اپنی کشتگاں کو دیکھ — ساتھ کن حسرتوں سے گڑتے ہیں

لطفؔ تو اور آستانِ علیؑ — واں ملائک جبیں رگڑتے ہیں[52]

---

[50] تذکرہ ہندی از مصحفی مرتبہ مولوی عبدالحق ۱۹۳۲ء میں یہ شعر اس طرح ہے صفحہ ۲۰۱

کوئی زخم اور بھی کہ اے قاتل — کب سے ہم ایڑیاں رگڑتے ہیں

[51] یہ شعر صرف "یادگار ضیغم" مخطوطہ ادارۂ ادبیات اردو میں موجود ہے (دیکھئے "یادگار ضیغم" میں مخطوطہ ۵۶۴ صفحہ ۵۵۲)

[52] یہ مصرع تاریخ گلزار آصفیہ میں اس طرح ہے

ع جہاں ملائک جبیں رگڑتے ہیں۔ (دیکھئے گلزار آصفیہ از غلام حسین خاں صفحہ ۴۵۰)

دی دلِ خستہ نے اُس زُلفِ گرہ گیر میں جان
نہ رہی شکر کہ دیوانے کی زنجیر میں جان
کشتہ سو جان سے میں اس یاسمن اندام کا ہوں
جس کی نکہت سے پڑے بلبلِ تصویر میں جان
کوئی کہدو یہ شتابی میرے صید افگن سے
کہ اب اک دم کی ہے مہماں تیرے نخچیر میں جان
واہ رے گرمیٔ خونِ رگِ جانِ عاشق
ڈال دے جوہروں سے یار کی شمشیر میں جان
دلبرو دل کی عمارت نہ بنی بعدِ شکست
رکھے عالم کی گر اس قصر کی تعمیر میں جان
مرغِ قبلہ نما کی نہیں بے وجہ طپش
کہیں بے چارہ کی اٹکی ہے ترے تیر میں جان
لوحِ دل چھوڑ کے نقشِ حجرِ صورتِ یار
کیجئے فرہاد کی ادنیٰ نہیں تقصیر میں جان
شیر ہے جن پہ رقیب ان پہ ہے اپنے تو حضور
جی کرے تب پڑے قالیں کے اگر شیر میں جان
گر نہ ہو جاتا شیطانِ مجسّم کو تو لطف
شیخ (کی) ذات (سے) اس خرقۂ تضویر[1] میں جان

---

[1] صحیح لفظ تزویر ہے

○

تم ہو بزمِ عیش ہے واں اور صحبت داریاں
ہم ہیں کنجِ غم ہے یاں اور جان سے بیزاریاں
تم کو سیرِ باغ و گلگشتِ چمن کا واں ہے شوق
یاں بدن پر ہیں ہجومِ داغ سے گلکاریاں
دھیان ہے آرائشِ زلفِ پریشاں کا تمہیں
یاد ہیں حالِ پریشاں کی مرے کچھ خواریاں
تم صفائے ساعد و بازو دکھاتے ہو وہاں
ہم پہ یاں موئے بدن کرتے ہیں نشتر داریاں
تم نے دکھلائی وہاں بیٹھ اور چوٹی کی پھبن
یاں میری چھاتی پہ ہیں کالے نے لہریں ماریاں
نیک و بد دونوں سے یاں ہم نے تو آنکھیں موندلیں
تم وہاں چتون کی دکھلاتے ہو جادو کاریاں

یاں برنگِ پیکرِ تصویر ہم خاموش ہیں
گفتگو کی تم دکھاتے ہو وہاں طراریاں
قہقہے تم مارتے ہو واں بہ آوازِ بلند
دشمنوں سے یاں چھپا کر ہم ہیں کرتے زاریاں

ہر مریضِ غم کی جاں بخشی کا ہے واں تم کو دھیان
کھنچ گئیں یاں طولِ شدت سے مری بیماریاں
اضطرابِ دل سے بے پردہ ہوا یاں رازِ عشق
سوجھتی ہیں واں تمہیں ہر بات میں تہ داریاں

کیا کسی سے بات کیجے بھولتے اک دم نہیں
اُن بھلاوؤں سے وہ باتوں میں تیری عیاریاں
چھین کر باتوں میں دل کو لطف سے وہ بُت بنے
یاد رکھنا غیر کی کرنا وہاں دلداریاں

○

غم کے عوض جلے وہ گریبان و آستیں
نت غرقِ خوں ہو جس کا نہ دامان و آستیں
کیا جانے لائی باغ میں کس گُل کی بُو ہمیں
رشکِ چمن تھا ورنہ یہ دامان و آستیں
دیکھا نہ ایک پل کے لئے بھی انھیں جُدا
یارب گرہ ہے دامنِ مژگان و آستیں
گر اشک آبِ دل ہے تو اعجازِ عشق ہے
باہم یہ ربط آتشِ سوزان و آستیں
کیا سرگزشت اپنی لکھیں تجھ کو ہم ہیں اور
موجِ سرشک و دیدۂ گریان و آستیں
مژگاں کا خونِ دل سے جو عالم ہے کچھ نہ پوچھ
ہے اتحادِ پنجۂ مرجان و آستیں
ٹک آستیں نچوڑ تو باور ہو ہم کو لطف
حضرت ذرا تو سمجھیئے طوفان و آستیں

نہیں یہ شیشہ، مت اے محتسب، مچا دھومیں
دھرا ہے آبلۂ دل، ہمارے پہلو میں
کب اپنی چشم میں طوفانِ نوح کو ہو قدر
نہاں ہے یاں، وہی عالم ہر ایک آنسو میں
اگرچہ فرق زمیں آسماں کا ہے تاہم
ملی ہے وضع فلک کی بہت تری خو میں
ہمیشہ شامِ غریبی کی دید ہے ہم کو
وطن ہے دل نے کیا جب سے اس کے گیسو میں
نہ جان کھا مری ناصح ہزار بار کہا
نہیں ہے یہ دلِ خانہ خراب قابو میں
ہوں اس کی زلف کے احساں کے شکر سے قاصر
اگر ہو قوّتِ گفتار ہر سرِ مُو میں
نہیں ہے تو بھی ہے ایاغ کے لب پہ لبِ شب و روز
کچھ آن کر میر الشیخ و محتسب جو میں
محبّتِ شہِ مرداں ہے شرطِ ایماں لطفؔ
یہی ہے فرق مسلمان اور ہندو میں
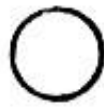
دل تک ہاتھ بھی لانے کی یاں طاقت اب پیہات نہیں
اور واں ہر آن فشارِ دل کے سوا کچھ بات نہیں
زلف کو اُس کی کہا سنبل دور یہ فہم رسا سے ہے
غنچہ کہتے اس کا دہن، پر غنچہ میں وہ بات نہیں
ابرِ بہاراں تجھ بن ہم کو کم نہیں تیر باراں سے
عالم کی برسات جو ہے وہ عاشق کی برسات نہیں
دن کو سرا و رزانوئے غم ہے شب کو ستارہ شماری ہے
زیرِ فلک عشاق میں کوئی ہم سا بد اوقات نہیں
جانِ غنیمت اہلِ دلوں کو آخر کو بجھتا وے گا تو
جور کی بھی اک جا ہے ظالم دل ہے یہ اژدہات نہیں
گئی جوانی آئی پیری موئے سیہ سب ہوئے سفید
نکلے غفلت، جاگ اے غافل صبح ہوئی اب رات نہیں
جائے دکن سے بادِ صبا گر کہیو ہند کے یاروں کو
صبر کا تحفہ بھیجو ہمیں اس سے بہتر سوغات نہیں
غیر کی خلطی اُس سے خدا دکھلائے نہ جیتے جی ہم کو
مر جاویں فرقت ہی میں، پر دیکھیں یہ مکروہات نہیں
بات پر اپنی آجاویں تو سر پر پہاڑ اٹھا لیں لطف
سچ تو کیا یہ لوگ ہیں وہ بھی جن سے اٹھتی بات نہیں

ہ

دل لگانے کو جو جاتے جانبِ گلزار ہو
سچ کہو کس گل کے پیارے طالبِ دیدار ہو
اپنی آنکھوں سے بھی بہتر دیکھیں کیا آنکھیں کہیں
ان دنوں ڈوبے ہوئے حیرت سے نرگس وار ہو
ساتھ معشوق کے آنکھوں میں ہے نشہ عشق کا
سچ کہو کس کی مئے الفت سے یوں سرشار ہو
ہم نے بھی کی ہیں یہ باتیں دردِ دل چھپتا نہیں
صاف تم تو کشتہ تیرِ نگاہِ یار ہو
وہ غرورِ حسن کیدھر اور کہاں وہ تمکنت
دل کے (اب) ہاتھوں سے کرتے اور ہی اطوار ہو
دن میں سو سو بار روتے ہو کسی کی یاد میں
گرچہ رونے کا سبب کرتے کچھ اور اظہار ہو
اب تو بیماری کا میری چاہیے ہو تم کو درد
آج کل تم بھی نصیبِ دشمناں بیمار ہو
کان دھر کر زاریاں اب تو ہماری بھی سنو
گرچہ تم چھپ چھپ کے کرتے نالہ ہائے زار ہو
کیا غضب ہوگا وہ جن سے تم نے یہ دکھائی زمیں
ورنہ اپنے کام کے تم بھی بڑے عیار ہو

سچ کہو میں ہوں تمہارا بارِ خاطر جس نمط
تم بھی اُس کی خاطرِ نازک پہ یوں ہی بار ہو
درپئے ایذا تمہارے ہے اسی صورت سے وہ
جس نمط تم دل جلوں کے درپئے آزار ہو
گر نہیں دل نذر کر بیٹھے کسی سفاک کو
لطفؔ کی سی طرح کیوں پھر جان سے بیزار ہو

○

دیکھ کر سرد کو کل یاد جو آئی مجھ کو
کیا قیامت تیری قامت نے دکھلائی مجھ کو
شمع پر جل گیا پروانہ اس انداز سے رات
کہ نئے سر سے پھر اک آگ لگائی مجھ کو
ناصحا تجھ کو گریبان کا دکھاؤں گا رنگ
یاد جب آگئی وہ دستِ حنائی مجھ کو
ہے مگر وادیٔ مجنوں کا پیاسا کوئی خار
کھینچتی ہے جو اُدھر آبلہ پائی مجھ کو
کتنا آزاد ہے اس قیدِ تعلق کے ساتھ
سچ کہوں وضع بہت لطفؔ کی بھائی مجھ کو

○

غبارِ بیکسی سے کیا ضرر پاکیزہ جوہر کو
کہ بخشی ہے جلا گردِ یتیمی آبِ گوہر کو

گند جا سر سے مانندِ قلم گر ہے سرِ شاہی
نہ آساں سمجھو یا ناسنیہ بختی کے افسر کو

رقم کیرائی مژگاں ہی اُس کافر کی ڈرتا ہوں
نہ نامہ چنگلِ شہباز ہو بالِ کبوتر کو لا کنا)

کبھی تو خاکساروں کا بھی غم خانہ کرو روشن
نہیں گو کچھ بھی نقشِ بوریا تو ہوگا بستر کو

چھلکتا غم کا اک دم میں پیمانہ ہے اے ساقی
وفا دشمن شتابی کر ذرا لبریز ساغر کو

بھرا مجنوں کا دل سنگِ ملامت سے نہ مرنے تک
بڑا ہی چاہیے بحرِ جنوں میں بارِ لنگر کو

کیا ہم نے تو ترکِ مدعا کو مدعا اپنا
خدا توفیق بخشے نیک چرخِ سفلہ پرور کو

بجائے اشکِ ریزاں گر رہوں فوارہ ساں لیکن
تشفیع مجرماں سنتا ہوں میرِ حوضِ کوثر کو

کھلا گر دفترِ اعمال مجھ نامہ سیہ کا لطف
کہاں کو پھیر گئی مجرم کی باری روزِ محشر کو

○

نہ کر اے بلبلِ دل سوختہ صیاد کا شکوہ
کہ جاں بازوں کے دیں میں کفر ہے جلاد کا شکوہ[1]

نہیں شیریں پہ کچھ موقوف یہ قسمت کی خوبی ہے
زبانِ تیشہ سے کوئی سنے فرہاد کا شکوہ

عجب اک دشمنِ جاں کو لئے پھرتا ہوں پہلو میں
کروں کیا دوستو اپنے دلِ ناشاد کا شکوہ

میں اپنے سرو قامت سے کہاں شاکی تھا گلشن میں[2]
تسلی ہو گئی قمری کے سن شمشاد کا شکوہ

نہ تنہا میں ہی اپنی خانہ ویرانی کا شاکی ہوں
کرے ہے اک جہاں اس خانماں آباد کا شکوہ

ترے کانوں تلک بھی لطف کچھ آواز آتی ہے
ہر اک عالم کو تیرے نالہ و فریاد کا شکوہ

---

[1] ع (ب) کہ جاں بازوں کے دیں کفر ہے جلاد کا شکوہ

[2] (ب) ع میں اپنے سرو قامت ہی سے کیا شاکی تھا گلشن میں

○

وہ بھلے جن کی محبت میں سدا بنتی ہے
اپنا تو جاتے ہی دل جان پہ آ بنتی ہے
کھینچ کرے ہی چلی آج تو بے تابیٔ دل
اس نئی محفل میں ہمیں دیکھئے کیا بنتی ہے
یہہ ہنر بھی تمہیں معلوم ہے اے شیشہ گراں
کوئی خاطر بھی جو ٹوٹے تو بھلا بنتی ہے
سوچ بے وجہ نہیں اس کو خدا خیر کرے
مژدہ اے دل کوئی پھر تازہ جفا بنتی ہے
قیس کی موت نے بے طرح بگاڑا رستہ
لطف جی جاوے تو پھر راہِ وفا بنتی ہے

○

نہیں معلوم کیا اس سینۂ سوزاں میں پنہاں ہے
کہ ہر تارِ نفس جوں رشتۂ شمع آج سوزاں ہے[1]

---

[1] تذکرہ عشقی میں یہ مصرع اس طرح آیا ہے۔
ع کہ ہر تارِ نفس مانند تارِ شمع سوزاں ہے
(دیکھیے "دو تذکرے" مرتبہ کلیم الدین احمد ۱۹۶۳ء - پٹنہ - صفحہ ۱۷۷)

سوادِ خطِ یکرنگی ہو تو ہے حسن و عشق ایک ہی
یہاں ہے خاطرِ برہم وہاں زلفِ پریشاں ہے
صبا آئی ہے کس گلرو کے کوچے سے تو گلشن میں
کہ چاکِ سینۂ بلبل ہر اک گل کا گریباں ہے
نہیں روزِ ازل سے سرخ خوں عاشقِ بے دل
میرے قاتل کی تہمت ہے کہ رنگیں طرفِ داماں ہے
نہ میں فرہاد ہوں اے عشق نہ مجنونِ دل خستہ
میرا پھر منتظر بتلا تو کیوں کوہ و بیاباں ہے
یہ راہ عشق ہے ناداں لباس اس کا ہے عریانی
پکڑتا برق کا دامن یہاں خارِ مغیلاں ہے
وفا سے دور ہے ظالم نہیں تو آہ اپنی بھی
حریم پردہ سوزِ عشق کی شمع شبستاں ہے
غذا خونِ جگر سے دے جسے گودی میں پالا تھا
وہ طفلِ اشک مجھ سے آج یوں دست و گریباں ہے
تیری طرزِ سخن پہنچی کہیں اے لطف گلشن میں
نئے انداز سے بلبل چمن میں اب غزل خواں ہے

○

کمر اہلِ وفا کی قتل پر جو دلربا باندھے
کوئی کیا اس وفا دشمن سے پھر عہدِ وفا باندھے

نہ دے برباد اپنے مشتِ پر کو آتشِ گل سے
کہوٹک شاخِ گل سے آشیاں بلبل جدا باندھے

نہیں ہوتا ہے کم ناآشنائی سے تو اس میں کچھ
جو پیمانِ محبت جھوٹ بھی وہ آشنا باندھے

دلِ اک عالم کا اُس کے ہاتھ سے بے ساختہ خوں ہے
قیامت ہو اگر ہاتھوں میں وہ اپنے حنا باندھے

نہ ہو دل تنگ غنچہ کے دہن تنگی کے دعوے سے
سخن ایسے پریشاں کا گرہ میں کوئی کیا باندھے

یہ عالم ضعفِ تن کا ہے کہ لاچاری سے رک جاویں
اگر مجھ ناتواں کی راہ شاید نقشِ پا باندھے

ہے اپنے خوں کا پیاسا خوار خار گلشن اے بلبل
کوئی یاں آشیاں مجھ کس توقع پر بھلا باندھے

کرے رو یاہ بازی ناخنِ تقدیر بھی واں لطف
غضب سے جو کہ عقدہ پنجۂ شیرِ خدا باندھے

○
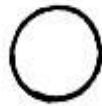
یوں ابر ہوا ہر خس و خاشاک سے باندھے
موہنہ دیکھو صدا اس دیدۂ نمناک سے باندھے

مرہم رکھے تو اس دلِ صد چاک پہ صیاد
دو پھول قفس کے میرے گر چاک سے باندھے

آفت ہو اگر اس دلِ جاں سوز کو عاشق
گھبرا کے کہیں گوشۂ افلاک سے باندھے

شبنم کے کئی قطروں پہ موقوف ہے اے گل
دعویٰ جو تو اس روئے عرقناک سے باندھے

ہے دور ہم اپنے سے موئے تیرے اے آہو
ضد بادِ صبا میرے کفِ خاک سے باندھے

جلنے کا کوئی آتا ہے پروانے کے انداز
ہر چند بگولہ پڑا یوں خاک سے باندھے

کیا جان ہے جلاد فلک کی، کہ جو دامن[1]
خونریزی میں میری بتِ سفاک سے باندھے

دیکھو ہنرِ بخت شکار اُس کا ہوا ہوں
جو صید ہو عنقا تو نہ فتراک سے باندھے

آقا ہے خدائی کا وہ جو عہدِ غلامی
اے لطف وصیِ شہِ لولاک سے باندھے

○

گھر آئے گر میرے تو کچھ دور نہیں ہے
اتنا تو میرا بد وضع بھی مشہور نہیں ہے[2]

---

[1] یہ مصرعہ مٹ گیا ہے مخطوطہ برمنی دیکھ کر لکھا گیا۔

[2] گھر آئے گر میرے تو کچھ دور نہیں ہے اتنا بھی تو بد وضع یہ مشہور نہیں ہے
(عمدہ منتخبہ ۵۵)

اد ٹھ جا میری بالیں سے کہ گھبرانے لگا دل
جان بر ہو مسیحا یہ وہ رنجور نہیں ہے
وہ زخم دل آلودۂ زنگار رہو یارب
جو سینۂ عشاق پہ ناسور نہیں ہے
کیوں چاک کا اور داغ کا لیتے ہو بہانہ
یہ کہیے کہ دل لینا ہی منظور نہیں ہے
بد حال تو ہر چند کہ تھا کل بھی بہت لطف
پر آج تو دم اپنے کا بھی مقدور نہیں ہے

○

خاکساری کا جو مزا سمجھے
تخت جم نقش بوریا سمجھے
کیا بھلی کٹ گئی اُنھوں کی جو
مدعا ترک مدعا سمجھے
شیخ اور برہمن میں کیوں ہے عناد
ہم نہ مطلق یہ ماجرا سمجھے
پھر نہ عقدہ کشا ہو غنچوں کی
بار احساں اگر صبا سمجھے
کتنے مغرور ہو عبادت پہ
شیخ صاحب ہو کیا بُرا سمجھے
خار ہیں کیا زباں درازی پہ
لطف تجھ کو برہنہ پا سمجھے

○

جس دن سے ہم جنوں کے ہیں داماں سے لگے ہوئے
دامن کی جا یہاں ہیں گریباں لگے ہوئے

اللہ رے قید خانۂ ہستی کہ دم کے ساتھ
ہر اک قدم پہ لاکھوں ہیں زنداں لگے ہوئے
رویا میں دیکھ مرقدِ مجنوں کو داڑھ مار
تھے جائے گل درختِ مغیلاں لگے ہوئے
بارے چھٹے اسیرِ بلا اُس گلی میں آج
ہیں تو وہ ہائے گنجِ شہیداں لگے ہوئے
یارانِ پیش روزرا ٹھیرو کہ جیوں جرس
ہم پیچھے پیچھے آتے ہیں نالاں لگے ہوئے
رکھ سوچ کر قدم میری وادی میں گردِ باد
پاؤں سے اپنے ہیں یہ بیاباں لگے ہوئے
کوئی تو میرے ناصحِ دانا سے یہ کہو
دل چھوٹتے ہیں باتوں میں ناداں لگے ہوئے
کیا دن تھے وہ بھی لطف کہ رہتے تھے مثلِ زلف
کانوں سے اُس کے ہم سے پریشاں لگے ہوئے

○
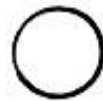
خورشید کی بھی آنکھ فلک پر جھپک گئی
ٹک جو گرہ نقاب کی اُس کی سرک گئی
نالوں نے میرے سقفِ فلک کو ہلا دیا
آواز اس پہ بھی نہ تیرے کان تک گئی

اپنا تو بدگمانی سے بس کام ہو گیا
گو اور طرح اس کی ہو جوں مسک گئی
گشتگی کا سر کریں افسانہ کس سے ہم
سُنتی تھی یک صبا سو وہ باتوں میں تھک گئی
جتنے تھے اس صفائے گلو کے جو گل مریض
ہر یک کی آج کہتے ہیں گردن ڈھلک گئی
نالہ کا آگے لطف کے دعویٰ ہے عندلیب
بس اے زباں دراز تو اتنی بہک گئی

○

سب کنارہ گیر اپنے اور بیگانے ہوئے
اب کے فصلِ گل میں ہم بے طرح دیوانے ہوئے
شہر میں پایا یہ تیرے جور نے شہرہ کہ اب
گھر یہ گھر ظالم میرے مذکور افسانے ہوئے
بزم میں آیا جو وہ گل رُخ جوں شمع
بلبلوں کی طرح جی دینے کو پروانے ہوئے
سنتے ہیں محتسب نے کی بیعتِ دستِ سبو
مژدۂ مے نوشاں کہ پھر آباد میخانے ہوئے
تو تو کس کا آشنا ہے ہاں مگر کہنے کو ہم[1]
آشنا ہو تجھ سے اک عالم سے بیگانے ہوئے

---

[1] مخطوطہ مجمع الانتخاب کلکتہ میں (کس کا آشنا کی بجائے "لوگوں کا آشنا")

حق ملا ترکِ ملاقاتِ پری رویاں سے کیے[1]
شیخ صاحب آپ تو ناحق میں دیوانے ہوئے
فصلِ گل ہے لطف اور خاموش ہیں طفلانِ شہر
کیا تہی یکبار دیوانوں سے ویرانے ہوئے

○

پھر ہوا اُس مژہ کو ربط اُس دلِ پاش پاش سے
آتی ہے آہ لب تلک آج نئی خراش سے
چھوڑ کے خط و خال و زلف وہ جو ہیں کشتۂ لباس
حکم ہوا ہے آج یوں اُنکے کفن ہو تاش سے

○

وہ صفائی کبھی جو ہم سے ملاقات میں تھی
صاف کل ساختگی اُس کی ہر اک بات میں تھی
جو بھلی آکے کہی سحر ہے سمجھا نہ اُسے
کل بُری جو کہی داخل وہ کرامات میں تھی

---

[1] مخطوطہ مجمع الانتخاب (کلکتہ) میں
خوباں گر ملاقاتِ پری رویاں سے کیے

ہے دلِ غیر کو اُس ناوکِ مژگاں سے اب اُنس
جو کہ نت اپنے جگر دوزیوں کے گھات میں تھی

سنتے ہیں غیر سے وہ بات باآوازِ بلند
کیا قیامت ہے کہ جو ہم سے اشارات میں تھی

کیا غضب ہے وہی آئینہ پن اب لاکھ سے ہے
جو صفائی کبھی ہم سے کسی اوقات میں تھی

کوئی حاجت نہیں اب غیر کی جو ہو نہ روا
یہ تو آگے نہ مرے قبلۂ حاجات میں تھی

اتنا جو پائے ملاقات نہ ہونا تھا لطف
شکل نبھنے کی جو کچھ تھی سو مساوات میں تھی

○

روشن ضمیر کیونکہ نہ ہوں دل کے داغ سے
خورشید کو ہے کسبِ ضیا اس چراغ سے

وہ خود فروش آگیا بارے چمن میں کل
بوئے خودی نکل گئی گُل کے دماغ سے

واہ ہو دے فضائے ہستیٔ موہوم کا بُرا
کُنجِ عدم میں کاٹتے تھے کس فراغ سے

اُس گلبدن بغیر ہمیں صبح باغ ... میں[1]
صوتِ ہزار کم نہیں فریادِ زاغ سے
جس دل زدہ کو نغمۂ بلبل ہو بانگِ زاغ
کیا خاک وہ شگفتہ ہو گلگشتِ باغ سے
گر جام وا ژگونِ فلک ہے یہی تو لطف
اپنے نصیب کیوں ہیں یہ درد اس ایاغ سے

○

خوبی کا تیری بسکہ اک عالم گواہ ہے
اپنی بغیر دیکھے ہی حالت تباہ ہے
عالم سنا جو نازکا ہے اس سے الامان
اندازِ گفتگو سے خدا کی پناہ ہے
تیوری کے ڈھب اور نگہہ کے ہزار ڈول
چتون کے لاکھ رنگ غرض واہ واہ ہے
ناخن یہ دل ہلال ہے ابرو کے رشک سے
مکھڑے کا داغ رکھتا کلیجے پہ ماہ ہے

---

[1] گلشن ہند کے مطبوعہ نسخے میں
"سیر باغ" آیا ہے ۔

خونریز تیری چشم کو بتلاتے ہیں دلے
چتون میں ساتھ کہتے ہیں پھر عذر خواہ ہے
خوبی کا تیرے بالوں کی مذکور ہے جہاں
سنبل کا نام اس جگہ اک روسیاہ ہے
دیتا ہے تیری قامتِ دلجو کا جو پتا
بے ساختہ وہ کھنچتا اک دل سے آہ ہے
گو لطفِ خفتہ بخت کے آؤ نہ خواب میں
لیکن تیرے خیال کو نِت دل میں راہ ہے

○
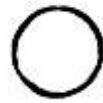
نہ آشنا کیجئے طلب گار کون آپ کا ہے
یہ غیر ہے تو یہاں یار کون آپ کا ہے
نہ ناز کیجیئے وارستہ خاطروں کے ساتھ
کدھر ہیں آپ خریدار کون آپ کا ہے
مسیحا اپنا ہے اک اور ہی لبِ جاں بخش
خدا کے فضل سے بیمار کون آپ کا ہے
ہم اپنی بے گنہی کو گناہ کہتے تھے
بگڑ گئے یہ گنہگار کون آپ کا ہے
تصور اور ہی بدمست کا ہے لطف کو اب
نہ آپ بہکیئے سرشار کون آپ کا ہے

○

روز اے جانِ جہاں آنے کو فرماتے رہے
واں رہا آنا ہی اور جان سے ہم جاتے رہے

آج تھا دل میں کہ دردِ دل کہیں گے اس سے
آتے ہی بس اس کے کچھ اوسان سے جلتے رہے

وائے حیرت آج تو تم بھی نہیں چشم اور ہم
پیش کش میں اُس کی نت لختِ جگر لاتے رہے

وہ مسیحا جن کی خاطر ہے مبارک ان کو ہو
ہم تو اُس کے ہاتھ سے آزار ہی پاتے رہے

سیکڑوں دل آشفتۂ خاطر پریشاں ہو گئے
کیا غضب ہے گھر میں تم زلفوں کو سلجھاتے رہے

تنگ ہے وحشت پہ اپنی وسعتِ ارض و سما
نت پھڑک کر اس قفس میں سر ہی ٹکراتے رہے

آج بھی بے لطفیٔ صحبت کا گلہ کرتا ہے
کل نہ سمجھا یار سو سو ڈھب سے سمجھاتے رہے

نامہ دے کہہ دیجیو اتنا زبانی نامہ بر
لطف جی سے جا چکا تم آج تک آتے رہے[1]

---

[1] یہ شعر صرف تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا مولف سعادت خاں ناصر میں ملتا ہے جس کو ڈاکٹر شمیم انہونوی نے مرتب کیا ہے۔ (دیکھیے خوش معرکہ زیبا صفحہ ۱۷۵)

○

دیکھا جن صورتوں کا شکل تھی آرام کی
اُن سے ہیں مسدود راہیں نامہ و پیغام کی
رخصت (اے) اہلِ وطن اب ہم ہیں اور آوارگی
حق رکھے بنیاد قائم گردشِ ایّام کی
یاد نے اُن تنگ کوچوں کی فضا صحرا کی دیکھ
ہر قدم پر جان ماری ہے دلِ ناکام کی
گردشِ چشمِ بتاں کہ بسکہ ساغر نوش ہے
گردشِ گردوں کو ہم کہتے نفے گردشِ جام کی
جب سے کھینچا لطف رنجِ فرقتِ یار و دیار
اب ہوئی معلوم محنت گردشِ ایام کی

○

کیوں دل پہ میرے جادو اُن آنکھوں کا نہ چل جاوے
جس پر کہ پڑے آنکھ سو دیوانہ سا بن جاوے
پلکیں وہ نکیلی کہ نظر جب پڑے اُن پر
سینہ میں یہ عالم ہو کلیجہ کا کہ چھن جاوے
بے چین بہت لطف کی ہے کل سے طبیعت
اللہ کرے آج وہ روٹھا ہوا من جاوے
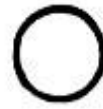
کیا سبب بتلائیں ہنستے ہنستے باہم رک گئے
خود بخود کچھ وہ کھنچے اُدھر اِدھر ہم رک گئے
دیر تک ضبطِ سخن کل اس میں اور ہم میں رہا
بول اُٹھے گھبرا کے جب آخر کے تیئں دم رک گئے

نہیں اہلِ زمیں ہی تنگ میرے نالۂ شب سے
فلک پر خواب کو کا رِ نمک ہے چشمِ کوکب سے
گزارا کاروانِ صبر و طاقت کا یہاں معلوم
نکلنا یوسفِ دل کا ہے مشکل چاہِ غبغب سے
ہوئے سیپارۂ دل لطف لاکھوں درہم و برہم
ابھی پاؤں نہیں باہر رکھا ہے اس نے مکتب سے

چھڑایا بند ہم سے تر دماغوں کے نہوروں نے
اُدھر کوئل کی کوکوں نے اِدھر زاغوں کے شوروں نے

نہ کہئے کیونکہ رشکِ مشہد پروانہ و بلبل
چراغ و گل نہ دیکھا تیرے مقتولوں کی گوروں نے
مُشبک ہے برنگِ خانۂ زنبوراب چھاتی
ہزاروں کو جھلیں سینہ میں دیں ان دل کے چوروں نے
دو کوہِ سیم آویزاں تری موئے کمر سے ہیں
بل اپنا کیا ہی دکھلایا ہے کم زوروں کے زوروں نے
ہوا آوارہ ہندوستان سے لُطف آگے خدا جانے
دکن کے سانولوں نے مارا یا انگلن کے گوروں نے

○
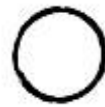
اِدھر سے جتنی یکانگت کی اُدھر سے اتنی ہوئی جُدائی
بڑھائی تھوڑی سی جب اِدھر سے بہت سی تم نے اُدھر گھٹائی
نہ ہم سے بگڑو نباہ دو جی نہیں ہے کچھ تم کو دھیان اس کا
کہے گی خلقت کہ ہو چکی بس وہ دیکھو دو دن کی آشنائی

○

کیوں مجھے اُس دلِ بیکس کا نہ شیون مارے
بیکسی جس کی کہ آتش پہ نہ دامن مارے

جب نظر آئے چمن میں نہ وہ نافرماں، نوش
کیونکہ غوطہ نہ خمِ نیل میں سوسن مارے

او میاں مجنوں جنوں میں بھی ہے بن پڑنی شرط
ورنہ دیوانے بہت پھرتے ہیں بن بن مارے

ہو زباں داں کوئی تو آئینہ کہتا ہے یہ صاف
اُس نگہہ نے ہیں بہت صاحبِ جوشن مارے

دہر میں کچھ نہ اگر ہو سکے تو یوں کر زیست
کہ نہ گر دوست جِلا دے تو نہ دشمن مارے

لطف بے ساختہ پھنسوا کہیں بیٹھے دل کو
ان دنوں پھر نظر آتے ہو بہت من مارے

○

سینکڑوں گُل ہوئے خوش رنگ چمن میں کھِل کے [1]
آخرش خاک ہوئے خاک میں سب رِل مِل کے

جس گھڑی یار مرا مجھ سے جُدا ہونے لگا
روئے ہم خوب طرح اُس کے گلے مِل مِل کے

آہ کیدھر کو چلے جاتے ہو چھوڑے تنہا
ہمرہو ہم بھی مسافر ہیں اسی منزل کے

لطف یہ شعر کہا جس نے عجب شاعر تھا
جس کے سُننے سے ہوئے ٹکڑے ہزاروں دل کے

---

[1] یہ غزل صرف تذکرہ خوش معرکہ زیبا از سعادت خاں ناصر مرتبہ مشفق خواجہ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۰ء ص ۲۰۴ میں موجود ہے۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر شمیم انہونوی نے اپنے مرتب کردہ تذکرہ خوش معرکہ زیبا میں لطف کی اس غزل کو کیوں نظر انداز کر دیا ہے (دیکھیے تذکرہ خوش معرکہ زیبا نسیم بکڈپو ۱۹۷۱ء ص ۱۷۵)

قصائد

در مدحِ میر عالم[1]

جہاں وابستۂ احساں ہے کس انصاف پرور کا
کہ دامِ صیدِ سعی باز ہے دانہ کبوتر کا
جوانانِ چمن کرتے ہیں عرصہ تنگ بہمن پر
چراغِ پیرزن ہوتا ہے سدِّ راہ صرصر کا
شبوں کو شمع کے شعلہ سے ہنگامِ ہم آغوشی
پرِ پروانہ لیتا ہے مزا بالِ سمندر کا

---

[1] مخطوطہ میں کوئی سرخی نہیں ہے قصیدہ سے پتا چلتا ہے کہ یہ میر عالم کی مدح میں لکھا گیا ہے۔

دلِ رگ زن میں گر گذرے خیالِ معنیٔ کاوش
رگِ دیوانہ بن پوچھے لہو پی جائے نشتر کا
بہم اضداد کو بھی اُنس ہے کنجشک کے گھر میں
برائے دفع سرما فرش ہے شاہین کے شہپر کا
گرا ہو نار کا جوں اخگرِ افسردہ خاکستر
شرارت پر مزاج اک خس برابر ہو جو افسر کا
معاً مردودِ بالیں پر دیوانہ ہو ہر سنگ
سرِ موگرم اگر شعلے سے ہو خاشاک بستر کا
زمانے میں رواج از بس کہ استغنا نے پایا ہے
عرض بھی ان دنوں شاید نہ ہو محتاج جوہر کا
بایں دستِ تہی دیتا چنار انگلی ہے کانوں میں
صبا کرنے لگی ہے ذکر کچھ گل کے اگر زر کا
عجب کیا گر جہاں مفروش ہووے عدل و احساں سے
کہ تابع چرخ گرداں ہے دکن کے عدل گستر کا
امیر عادل عالی ہمم وہ میر عالم ہے
رہینِ بخشش کا اک عالم ہے اب جس معدلت گر کا
کب اس کے درخورِ ہمت پہنچ سکتا ہے زر ہر چند
سدا اکسیر سازی کام ہے خورشیدِ خاور کا
جبیں جس صاحبِ طالع کی پا اُس کے ہو کی در سے
رہانت آستاں بوس آسماں اس بخت یادر کا

ہے اس کی صید گاہِ خلق یاں تک ناتواں پرور
کہ حاسد ہے شکارِ فربہ اس جا صیدِ لاغر کا
نہ ہو کیوں بند موسیقار کا دم اس کی محفل میں
بلند و پست کو رتبہ نہیں ہے واں برابر کا
کہاں لکے اخگر و انجم کہ اس کی بزمِ حشمت میں
بایں دُود و دخاں خورشید کب لائق ہے مجمر کا
نہ ہو کیوں منحنی دشمن کہ طبعِ مستقیم اُس کی
کرے ہے آسماں بھی راستی سے کام محور کا
نگہ قاصر ہے اس کے اوجِ حشمت کے نظارے میں
کھُلے پھر کیا بُلند و پست قصرِ جاہِ قیصر کا
کہو حاصل کرے رنگِ طلائے عشق میں اس کے
جہاں میں ہووے جویاں جو کوئی گوگردِ احمر کا
نہیں ہے بدسگال اُس کے گو عزت نیم جُز دل بھر
اگر و کھتا ہو رُتبہ فی الحقیقت گاوِ عنبر کا
کروں ہوں مطلعِ ثانی میں طوفِ قبلۂ محفل
کہ یک مدت سے ہوں احرام بند اُس کعبۂ در کا
وہیں گردن عدو کی پھینک دے بس بار ہے سر کا
سرِ دشمن سے خواہاں ہو جو تو میداں میں مغفر کا
مقرر ہوتا ہے کافور اپنی زنگاری کا اس جا گھہ
مداوا کیا ترے منکر کے ہووے زخم منکر کا

تیرے اعدا کے بجا ہے اب مال کی قلت میں کیا ہے شک
پدر کا خون پسر کو جب کہ ہووے شیرِ مادر کا
درختِ زندگانی کا ثمر تیری محبت ہے
تبر ہمدم نہ ہو دشمن کے کیوں کر نخلِ بے بر کا
عدو کی عرش پروازی کہاں تیری حضوری میں
کہ نیت تارِ شعاعی بند ہے ہے مرغِ شب پر کا
نہ کیوں کر بند پھر حاسد کا دم ہو رو برو تیرے
کہ کرتا ہے نفس سینے سے اس کے کام خنجر کا
عجب کیا ہے شمیمِ خلق سے تیری خجل ہو کر
پھرے گر کارواں سوئے تتار اب مشکِ اذفر کا
تیری مسندِ کرم روشن ہے آئینہ سی عالم میں
بجا ہے تو اگر دستورِ اعظم ہو سکندر کا
توجہ ہے ٹک اب اے آبیارِ گلشنِ عالم
سماعِ نالہ گر اس بلبلِ بے بال و بے پر کا
کیا ہے بسکہ ضبطِ نالۂ آذر گداز یک عمر
میرے سینے سے لب تک جوش زن دریا ہے آذر کا
مخاطب تجھ سا روشن دل نہ ہووے پر بہ رنگِ شمع
زباں تک سوز آوے اس دلِ اندوہ پرور کا
ہر یہ نکتہ دانی پر یہ دعوئے شہنشاہی
بحقِ راستی حق ہے میرا کچھ رکھنا افسر کا

لطافت شعر کی میرے رہی ہے جیں بہ پیشانی
کروں موئے سر زلفِ پری گر تارِ مسطر کا
وہ بندش تنگ ہے مجھ خاندانِ نظم کی میری
ملا سہواً بھی جس مصرع سے رشتہ سلکِ گوہر کا
نہ خاکستر بھی اس آتشکدہ میں مجھ ملے اُس کا
جو عمداً گرم کرکے باندھ دوں مضموں سمندر کا
بتِ معنی کی آجاؤں اگر صورت تراشی پر
تو کافر ہوں نہ کردوں سرد گر ہنگامہ آذر کا
کرے عرضِ ضیا جس جا مری طبعِ صفا پرور
صفا سے مارے واں دم منہ تو دیکھو صبحِ خاور کا
بایں جنسِ گراں قیمت زمانے کی کسادی سے
ہوا ہے مجھ پہ زنداں چارسو اس ہفت منظر کا
گلہ ہے فرض تجھ سے زنگِ کلفت کی تعدی سے
کہ تجھ سا قدرداں ممکن نہیں پھر اہلِ جوہر کا
کہوں کیا بد تراشی گنجفہ بازانِ زمانہ کی
یہ ہر رنگِ آب ہے مجھ اختر سوختہ سے اس بداختر کا
مہرِ شمشیر ہے میری برات اس بد تماش اوپر
بغیر از درہمی نادر ہے گر ہو حکم ابتر کا
زبس فرزیں نہالی پر رُخِ لیلاجِ دوراں ہے
شبیہِ خانۂ شطرنج ہے نقشہ میرے گھر کا

مری کشتِ امل کی پائمالی پہ ہوا مائل
بنامِ کشتِ جا ہے بیلِ گردوں یک اگر سر کا
یہ سطحِ خاک کا مجھ کو ہوا ہے نرد کا تختہ
فضائے شش جہت میرے لیے عالم ہے ششدر کا
یہ ہے نقشِ مرادِ دہر ہی جو دادِ ناکامی
کرے بازی گہہِ گیتی کو مجھ پہ کام اژدر کا
مری روشن سوادِ تیرہ بختی کی ہوئی باعث
ممد ہے ورنہ یہہ دوں آشنا ہر کور اور کر کا
زمانے کی صف آرائی کا شاکی تجھ تک آیا ہوں
کہ اے عالی نسب فرزند ہے نوشاہِ صفدر کا
خوش اقبالی کو مژدہ تیری ادراکِ زماں سے ہے
بس آ پہونچا زمانہ حال کے میرے فرا خور کا
نہیں ہے موج خیزِ غم سے خوف (اب کشتیٔ دل کو)[1]
بڑا بھاری وسیلہ ہے کرم کے تیرے لنگر کا
مسافر پہ در اعاجز تو از آسماں قدر را
سدا عرضِ غرض شیوہ نہیں اس عبدِ احقر کا
میری فکر اتنی واجب ہے کہ بس اب غیر فکر مدح
نہ میلِ طبع گاہی سوئے زانو ہو مرے سر کا

---

[1] خوف کے بعد الفاظ مٹ گئے ہیں مخطوطہ جرمنی میں یہ شعر موجود ہے ۔

قسم مجھ کو صفائے خاطرِ دُردی کشاں کی ہے
یہ دل سے عہدِ محکم ہے اب اس خاطر مکدّر کا
کہ مدح و ذم میں مملو اک جہاں میں ہووے تو ہرگز
نہ ہوں دیندار کا مداح نے ہاجی ہوں کافر کا
بہ یمنِ مدحِ فرزندانِ زہراؑ دین و دنیا میں
شرف بس ہے مجھے مداحیؑ آلِ پیمبرؐ کا
نشانِ بندگی میرا مزین اس رقم سے ہے
کہ فدوی ہے ابوذرؓ کا یہ اور بندہ ہے قنبرؓ کا
رجائے مغفرت یہہ ہے منقش اس وسیلے سے
کہ نقشِ آب ہے اب خوف مجھ کو روزِ محشر کا
تری بھی مدح اے عالی نسب داخل انہوں میں ہے
بحمد اللہ کہ میں مداح ہوں اولادِ حیدرؑ کا
صلہ اس مدح کا بھی واں ترے اجداد سے لونگا
نہ لوں یاں بدلے اک مصرع کے حاصل ہفت کشور کا
خبر جس دن نہ ہووے خلق کو جیب و گریباں کی
مرا ہاتھ اس دن اور داماں ہے ساقیؑ کوثر کا
پر اتنی عرض اے حاجت روائے خلق ہے تجھ سے
کہ میں خواہاں نہیں کچھ ملک و کوس و طبل و لشکر کا
توجہ اتنی فرما تو کہ ما یحتاج کی رو سے
نہ ہو محتاج عند الوقت سیم و زر و گوہر کا

ادب سے دور ہے عرضِ مکرّر لطف سے ہرچند
مزا ہے لطف کی تکرار میں قندِ مکرّر کا
ہوا طولِ سخن اب خاتمہ بہتر دعا پر ہے
طریقہ جو کہ ہے مدحت گرانِ نظم گستر کا
جہاں میں جب تلک زہر و شکر تلخی و شیرینی
کریں معمول پر اپنے اثر کیا خیر کیا شر کا
شکر دے تلخ کامی زہر کی بد خواہ کو نت رے
کرے تلخی، زہر احباب سے نت کام شکر کا

○

در مدحِ ارسطو جاہ

ہوں آشنائے بحرِ سخن کیوں نہ نظمہ خوار
عمانِ مدح کا ترے پیدا نہیں کنار
نظارۂ علوئے مراتب میں سایہ سال
ہیں سر بہ پا بلند تلاشانِ روزگار
زینے شمار کب ہوں ترے اوجِ قدر کے
ہے اولِ قدم یہاں ختمِ آخرِ شمار
حاشا کہ اعظم الامرا کے خطاب سے
ہوائے چراغِ چشم کہاں تجھ کو افتخار

کیوں کر کہ مائدہ بصفا دید کے ترے
کتنے ہی اعظم الوزرا ہوں گے ریزہ خوار
گر چشم پوشیاں نہ کریں اہلِ دید تو
ہم چشم گو ہے تیرا خرم شاہِ شہریار
کسریٰ نسب ہے کیوں نہ ہو انصاف دوست تو
میراث تیری عدل ہے اے معدلت شعار
دب کر ترے زمانے میں ہر اک ضعیف سے
دار و مدار گر نہ کرے چرخ بے مدار
قطرے کی طرح جھڑ پڑیں انجم بہ روئے خاک
ایسا ہی دستِ قہر ترا دے اُسے فشار
خاطر پہ کاہ کے جو ذرا بار (ہو وے کوہ)[1]
کر ڈالے تیرا شحنۂ عدل اس کو سنگسار
سرگرم رقص بہر خوش آمد ہو مثلِ خرس
ہو جائے گرگ میش سے سہواً اگر دو چار
جوں خونِ مردہ خشک رگِ سنگ میں ہو آگ
دیکھے نگاہ گرم سے پنبہ کو گر شرار
بے جا کرے غبار کو گر جا ہے سیلِ تند
بے آبرو دیوں میں گرفتار ہو نخار

---

[1] دیوان میں مٹ گیا ہے مخطوطہ جرمنی سے لیا گیا۔

بیچش کرے جو موج ذرا خس سے تو وہیں
گرداب ہووے خاک نشیں گردباد وار
نکسیر پھوٹے گر کہیں بلبل کی باغ میں
سنتے ہی اپنا خون چمن میں کرے بہار
منصورِ عندلیب پہ ناحق جو چھا ہیں گل
ہو جائیں وہیں خار سب استاد شکل دار
سرشار ہے جہاں مئے عشرت سے کیوں نہ ہو
مفقود تیرے دور میں دردِ سرِ خمار
حافظ ہو جس کے غارِ ہلاکت میں تیری حفظ
ہوں نسجِ عنکبوت اُسے آہنی حصار
مقہور تیرا کوہ میں لیوے اگر پناہ
ہووے دہانِ اژدر اس کے ہر ایک غار
پھر جائے جس سے یک سرِ مژگاں تیری نگاہ
دیوے نظر سے اس کو گرا چشمِ اعتبار
صیقل طلب ہوا نہ تیرے ہیرائے سے
رہ جائے کیوں نہ ماہ کا آئینہ لکّہ دار
اُڑ جائے رنگِ زرد عدو کیوں نہ تجھ کو دیکھ
سُن آمدِ بہار کرے ہے خزاں فرار
مشتاق ہیں زلبس تیرے دشمن کے رنج و غم
دریا کی شکل میں ہمہ تن صورتِ کنار

بدخواہ کو تیرے نہیں پہچانتی اجل
یاں تک ہوا ہے خوار و ذلیل و نحیف و زار
مرجاویں کیوں نہ ڈوب کے تیرے حسود کو
ماہی کی طرح جزوِ بدن ہے حسد کا خار
اُس بیکسی کے ساتھ مرے گا تیرا عدو
رووے نہ جس کی گور پہ شمعِ سرِ مزار
کس کس مبالغوں سے تیری بزم جود میں
کرکے غلو ہے مطلع ثانی نے پایا بار
بخشش نے تیری رشکِ بیاباں کئے بحار
ہمت سے تیری غیرتِ دریا ہے کوہسار
ہو غرق موجِ کشتیِ آب گر سپہر
عمانِ کف سے ہو ترے گر ابر مایہ دار
سائل ترے کے دھیان میں مژگانِ مو سے
موہوم جس حصولِ تمنا کا ہووے تار
تیرے کرم کے رو بہ رو وہ رشتۂ عطا
حق الیقیں کی حبلِ متیں سے ہے استوار
ہووے اگر تو گرم تماشا چشمِ فیض
سرسبز ناروں سے ہو گریز کا اثار
اہلِ ہنر کو پر تو کلفت کی گرد میں
مانع نہ ہو سواد کا تیرے خطِ غبار

گر جہر قدر دانی کا تیرے نہ ہو فزوغ
ہو روز علم آج شبِ جہل سے بھی تار
روزِ دغا ہیبت سے تیرے صفِ عدو
برہم ہو بادِ تند سے جوں مور کی قطار
قبضہ کماں کا گر ترے آگے کرے حریف
ڈس جائے اُس کا تیر و ہیں اُس کو شکلِ مار
کیا خاک پھر بجھے لبِ زخمِ عدو کی پیاس
تر آبِ شور سے تیری تلوار کی ہے دھار
قہرِ خدا ہے خود پہ دشمن کہ تیری تیغ
ٹھہری ہے کب وہ کر کے جگر گاہ سے گذار
یوں پشتِ زیں سے بہہ کے نکل آئے زیرِ تنگ
کہتے ہیں جوں عوام کہ صابن میں جیسے تار
تنہا نہ فرقِ مغفری اس پاس ہے کدو
بازوئے بکتری کو بھی سمجھے ہے ایک خار
زخمِ حمائلی سے گلے میں حریف کے
زیرِ کمر ہی اترا ہے جو اُس نے ڈالا ہار
پھڑکے گا اپنے خون میں کیا خاک اس کا صید
ایک سانس لے سکا نہیں جس کا کبھی شکار
تھا گر حریف اس کا پیادہ تو دو ہوا
اور چارہ پارہ اس نے کیا تھا اگر سوار

ہے زیرِ راں ترے جو اسپ پری جمال
کحلِ ضیائے چشمِ صباحس کا ہے غبار
کہتا ہے یوں نسیم سے ہنگامِ جست و خیز
ٹھوکر سے بچ آئے گا تک مفلوجِ رعشہ دار
گا ہے سبک عنانی ہے دریا پہ جوں حباب
وقتِ گراں رکابی ہے آتش میں جوں شرار
آہن سُم ایسا سنگ کے سطح پہ وقتِ دشت
پرکار وار نقش کرے دائرے ہزار
رنگِ حنا میں دہے عرق یوں کفل پہ زیب
خون کردہ جیسے عارضِ خوبانِ گل عذار
چھو جائے گر ہوا تک (اس آتش مزاج کو[1])
مشکل ہے پھر کہ لے کرۂ خاک پر قرار
آباد اس کا خانۂ زیں تجھ سے نت رہے
راکب کو ایسے چاہیئے ایسا ہی راہوار
اے آبیارِ گلشنِ امیدِ کامیاب
کھٹکے ہے دل میں نت ترے مداح کے یہ خار
تجھ سا سخن شناس زہے تا یہ یا محک
مجھ سا سخن تراش نہ پایا نہ یہ سر غبار

---

[1] دیوان میں مٹ گیا ہے مخطوطہ جرمنی اور سالار جنگ دیکھ کر لکھا گیا ہے۔

ناصر علیؔ وقت کہوں گر میں آپ کو
اس کا مجھے بہ جانِ سخن گر ہو افتخار
کیوں کر اُس کے زادۂ افکار کا جگر
اکثر گرفتِ اہلِ معانی سے ہے فگار
اور طبع زاد پر میرے گر سہو ہے حسود
انگلی رکھے تو کاٹے بدندانِ انکسار
تیری جناب کو کہوں گر ذوالفقار خاں
ہر چند تھا وہ مخرِ امیرانِ نامدار
پر نکتہ دانیوں سے تیری اے دقیقہ سنج
عشرِ عشیر رکھتا تھا کب خانِ ذوالفقار
اس پر کیا ہے اس نے جو ناصر علی کے ساتھ
حاجت نہیں بیاں کی زافراطِ اشتہار
موقع تو ہے پڑھوں جو وہ مطلع حضور میں
جس پہ ہوا وہ معدنِ ہمت ہے زرنثار
"اے شانِ حیدری ز جبینِ تو آشکار
نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار"
جز لفظ ذوالفقار نہیں کوئی اس میں بات
ایسے کہ ڈال دویں سپر جس کے آگے یار
آئین قدر دانی میں لیکن برائے نام
لازم یہی تھا کر گیا جو خاں باوقار

ناصر علی کہاں ہے کدھر ذوالفقار خاں
رطب اللساں ہے آج وہی نظم آبدار
نقشِ حجر ہے صفحۂ عالم پہ اُن کا نام
ہو جائیں گو کہ مضمحل اوراقِ روزگار
کہتے ہیں فارسی میں سبھی طبعِ مطلعی
ہاں در جواب مطلعؔ ناصر علی بیار
اے ذرہ ہا ز نام تو خورشیدِ اعتبار
تاثیرِ اسمِ اعظم از اسم تو آشکار
اس گفتگو سے مجھ کو اے ممدوحِ ذوالکرام
منظور عرض کرنا سخن کا ہے اقتدار
گر مدعا ہے اس سے تو حُسنِ کلام ہے
حسنِ طلب کو دخل نہیں اس میں زینہار
کافر ہوں میں اگر مرے وہم و خیال میں
ایسی رکیک باتوں کو سہواً بھی ہو گذار
بلکہ صلہ کے نام سے مجھ پر حرام ہے
لے ایک سے پچاس تک اور سو سے سو ہزار
کیوں کر کہ شاعری میری میراث کچھ نہیں
نے فخر میں سمجھتا ہوں اس کو نہ ننگ و عار
فن سپہ گری میں وہ ہے کسب کونسا
جو جانتا نہیں میں بتائیدِ کردگار

پر اپنا ذکر اپنی زباں سے نہیں ہے خوب
کھل جائے گا وہ تجھ پہ کسی روز وقتِ کار
کل کی ہی بات ہے یہ مسافر وطن میں تھا
سو دو سو آشنا کا حقِ بندگی گذار
شکرِ خدا کہ آج بیک بینی و دو گوش
گرچہ دکن میں ہے نہیں ہر در پہ خوار زار
ہرچند ہے تیری ہی عنایت سے یہ سکوں
لازم دگر نہ تھا بشریت کو اضطرار
لابد ہے جب کہ جمع ہو خاطر بیان جو
طامع ہے دربدر جو پھرے مجھ ذلیل و خوار
کنجِ خمول کو میں سمجھتا ہوں خانہ باغ
سیرِ بیاضِ شعر کو گلگشت سبزہ زار
کرتی جو کچھ کتاب ہے مجھ دل کباب سے
یہ غم تراشیاں نہ کرے یار غمگسار
تنہائی میں بھی خوش ہوں بہ یمنِ قلندری
یارانِ پوست پوش میں کچھ ہیں کچھ لیار
طولِ سخن گذر گیا حدِ ادب سے وائے
اطول ہوا اب کروں جو طوالت میں اعتذار
اس سامعہ خراشی سے مجھ کو جو ہے غرض
سو یہ ہے اے امیرِ فلک قدر ذی تبار

سرکار سے ہے تیری جو راہِ تفضلات

ہے ڈیڑھ سو روپے تیرے خادم کا ماہوار

ہر چند جائے شکر ہے پر عرض کیا کروں

جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل اور نہار

بے گفتگو پچاس تو اُن ڈیڑھ سو میں سے

ہو کر سوار چھاتی پہ لے جلتے ہیں کہار

خلقِ خدا کا بار اُٹھاتی ہے پالکی

میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار

باقی جو ستّر ہے کئی دن میں زباں پہ ہے

مثلِ مجردات فقط اُن کا ہے شمار

بیزار اک جولوں سر دشمن کے واسطے

بیزار جی سے ہوں تو نہیں بنتے پھر ازار

تجھ سا ہو قدر دانِ نکات اور نکتہ سنج

یوں ہو اسیر پنجۂ چرخِ ستم شعار

فضل و ہنر جو مجھ میں وہ ہے سب پہ یک طرف

اور قدر دانیاں تیری سب میں ہیں یک کنار

آہن ہوں گر خشونتِ بختِ سیہ سے میں

کیدھر ہے پارسی تیری کسریٰ کی یادگار

ہے ہمتِ بلند کا تیری جو اقتضا

اُس امر میں جو ہے تجھے آمادہ اختیار

از بس کہ کم دماغ ہوں ضیقِ معاش سے
بالفعل تو اضافہ کا ہوں گا امید وار

لیکن نہ وہ اضافہ جو ہووے برائے نام
کافر ہوں سو پچاس میں گر ہو کسی کا کار

تضعیف اصل چاہتا ہے تجھ سے یہ ضعیف
کیوں کہ یہہ بے حیائی نہیں ہوتی بار بار

غالب ہے تجھ پہ شاق نہ ہوں میرے تین سو
چھ سو جب امیدوں کو تو دے بلکہ چھ ہزار

یوں ہے یقیں کہ لوحِ جبینِ سوال کو
تزئیں کرے ابھی تری کلکِ قدر نگار

بس لطف اتنی بے ادبی تجھ سے ہے بعید
ہو اس نفس درازیوں سے اپنی شرمسار

دے شاہدِ دعا کو بس اب جلوہ فروغ
چشمِ قبول کب سے (ہے) کحولِ انتظار

جب تک جہاں میں نامِ بہار و خزاں کا ہے
اور ابر تر ہو گلشنِ دنیا کا آبیار

باغِ اہلِ عدو کا ترے رہوئے نت خزاں
اور گلشنِ امید ترا ہو سدا بہار[1]

---

[1] ارباب نثر اردو میں "باغِ عمل" لکھا ہے "مخطوطہ دیوان لطف میں" اس قصیدہ کے (۱۰۱) اشعار ہیں سالار جنگ کے مخطوطہ میں (۱۰۳) ہیں (۲) اشعار کو مکرر لکھا گیا ہے۔

قصیدہ در مدح

نواب ارسطو جاہ[1]

تھی جو مرغِ فکر کو منقارِ حسرت زیرِ بال
جیسے ہیں آج وا ہے عید کا جیسے ہلال

نغمہ پردازی میں ہے سرگرم اس انداز سے
جس کے آگے ناطقہ ہو مرغِ خوش الحاں کا لال

ہر نوائے نغمہ پرور تہنیت آہنگ ہے
ہر صدائے زمزمہ گستر ہے اک فرخندہ فال

---

[1] مخطوطہ گلشن پنجاب میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے بعد سرخ روشنائی سے "قصیدہ در مدح امیر اعظم ارسطو جاہ بہادر" لکھا ہے۔

دیکھ اس خوش لہجگی کے ساتھ سرمستِ نشاط
باعثِ تفریحِ خاطر کا کیا میں نے سوال
مثلِ مینا ہنس کے میری سرگرانی پر کہا
پنبۂ افسردگی ٹک گوشِ غفلت سے نکال
آج لبریزِ طرب ہے اک جہاں ساغر کی شکل
مستِ قہقہہ ایک عالم ہے صراحی کی مثال
جلوہ فرما ہے ارسطو جاہ بہرِ نذرِ عید
چار بالش پر وزارت کی بصد جاہ و جلال
وہ ارسطو جاہ جس کی بارگاہِ عالی کے
ہیں گے مزدورِ درِ عشرت سرا رنج و ملال
سرپرستِ مملکت اب وہ رئیس الملک ہے
کیوں نہ مستاصل دماغِ دہر سے ہو اختلال
فیضِ عام اس کا ہے عالمگیر جیوں خورشید و ابر
بحر سے لے تا بہ بر اور دشت سے تا جبال
ابر و یم بے ساختہ خجلت سے پانی پانی ہیں
دیکھ اُس ذی جود کا فیضِ کفِ دریا نوال
مرہمِ زخمِ غریباں بس کہ اس کا لطف ہے
شامِ غربت سے عیاں ہے خندۂ صبحِ جمال
از نظر افتادہ اُس کا چرخ سے سنبھلا نہ ایک
پائے افتادہ دہر کے لاکھوں لیے اس نے سنبھال

گر نہ ہو اُس کی فتوت قدر دانِ مردمی
آج کرتا ہے یہ چرخِ زن صفت قحط الرجال
مقتضائے عادتِ افلاک سے ازبس کہ ہے
ہر دم اُس کسریٰ نسب کا عدل کے جانب خیال
ہے بجا کہیئے اگر نوشیرواں پیدا ہوا
آج بعد یک ہزار و دو صد و ہفتاد سال
معدلت سے اس کی ہے کوتاہ یاں تک دستِ ظلم
عود کو دیتے ہوئے ڈرتا ہے مطرب گوشمال
خوف ہے ازبس مبادا ہو ادا ناحق بہ دل
کر نہیں سکتے بُتاں عشاق پر عرضِ جمال
دامنِ دولت میں اس کی مختلط ہیں ایک جا
باز و کنجشک و ہمام و شیر و بُز گرگ و شغال
اس کے عقل و ہوش کو چاہے کریں مل کر فہم
باہمہ ذہن و ذکا یہ فلسفی کی کیا مجال
تہہ کرے زانوادب کے عقل کے آگے عقول
ہوش کے آگے ہو حس کے مشترک کو انفعال
ہیں جو اس کے جامِ طبعِ پاک کے یہ جرعہ کش
دُرد ان کے سامنے ہے ساغرِ جم کا زلال
مکتبِ فکر میں اُس کے اطفال ابجد خواں جو ہیں
حسبِ ارسطو طبع کو دیکھو ہے افلاطون خصال

حاسد اس کا وہ سواد الوجہ فی الدارین ہے
بخت سے جس کے سیاہی وام لے چشمِ غزال
باریابی جا تہا ہے مطلعِ ثانی کے بیچ
مدح غائب سے نہ ہووے سیر یہ مدحت سگال
جس جگہ برپا ہو تیرا خیمۂ عز و جلال
مبتذل ہے واں فلک کے اطلسِ کہنہ کے بال
عید مجھ کو موسے تیرے ہے کہ شکلِ ماہِ نو
بے تکلف حلقۂ گوشِ اطاعت پر ہے دال
ہو ہلالِ چرخ اُس کے زیرِ پا جوں نعلِ کفش
جس بلند اختر کے ہاتھ آدے تیری صفِ نعال
ہے تیرے فتراک کے قابل تو ہے چرمِ سہیل
ورنہ کس لائقِ ادیم طائفی کی ہے دوال
جس زمیں پر ہو ترشح تیرے ابرِ طبع کا
پھوٹے واں برگِ شجر شکلِ زبانِ خوش مقال
ریشہ دوڑا دے زمینِ جانِ بطلیموس میں
آبیاری سے تری سرسبز ہووے جو نہال
ہیبتِ تقریر سے اے مجمعِ انواعِ علم
صاحبِ تحریر کا ہووے تیرے آگے یہ حال
دے تجھے مجموعِ ضلعین جاری سے جواب
زاویوں سے ہووے ماموں کے گر تیرا سوال

ہے وہ پھر مردودِ درگاہِ یقیں نزدِ عقول
جس میں تیری عقلِ دوراندیش کو ہو احتمال

سر جو ہو پیچیدہ تجھ سے ہو بریدہ مثلِ زلف
دل جو ہو آزردہ تجھ سے ہو سیہ مانندِ خال

فی المثل رستم ہے زعم اپنے میں گر تیرا عدو
ہے زمیں گیر و نگوں سر تیرے آگے مثلِ زال

زال ساخم ہے عدوئے نکج سرشت اور تیرا تیر
راست رو دشمن کے دل میں جوں الف مابین ذال

گر نہیں دشمن ترا کافر تو اعدا کا تیرے
خون ہے پھر کیوں مباح اور مال ہے پھر کیوں حلال

اے سراپا جود جس جا ہو تیری ہمت کا ذکر
نقصِ ہمت ہے بیاں واں کرنا حاتم کا کمال

بخشے محتاجوں کو تو اک دم میں دونوں ہاتھ سے
بحرِ گوہر گر ہمیں اور کانِ جوہر ہو شمال

آبِ خجلت ہے بہا یا کوہ نے دریا کی شکل
جنتِ بخشش میں تیری یاں کے محضر اپنا مال

نالۂ زارِ گدا کرتا ہے کارِ صوتِ چنگ
شوق میں لاتا ہے یاں تک تجھ کو سائل کا سوال

خیرہ کردے برق ساں چشمِ عدوئے خیرہ رائے
وہ تجلی آفریں ہے تیری تیغِ مہ صقال

کیوں نہ روشن دل ہو جوں خورشید وہ آئینہ تن
خونِ اعدا سے میسر ہے اُسے اکلِ حلال
بس کہ ہے اک خرمنِ گل سہرے کے پاؤں تک
ہے نسیم صبح سی ماتا تری گل گوں کی چال
پر وہ رشکِ نکہتِ گل وہ تو ہم جلوہ رہی
چومے ہے بادِ صبا جس کی رکاب بہ امتثال
اچپلا میٹ اس کی شکل سوجھتی معشوق کو
رنگ عاشق کو سبک پروازیاں اس کی محال
معرکہ میں خون سے اعدا کے ہنگام نہیب
کردے رشکِ گلشنِ فردوس میدانِ قتال
وصفِ بیلِ کوہ پیکر کا ترے کب ہو کہ یاں
خامہ رکھتا ہے قدم مثلِ سیہ مستاں سنبھال
ابرِ رحمت ہے یہہ مجنوں کو وہ گردوں منزلت
اور اعدائے سیاہ دل کے لئے ہے جس کا کال
جان پر دشمن کے ٹوٹے آسماں جب اس کو دیکھ
کیوں نہ مثلِ سبزہ رہ پھر ہو اس کا پائمال
اس شکوہ و شان پر دلکش ہے ظالم اس قدر
ہے بجا گر اس کو رخسارِ بتاں کا کہئے خال
مردمک ہے یا سیاہ چشمِ بتانِ ہند کے
جس کے بندے دلبرانِ زنگ ہوں کیفیل و قال

ہے شبک رو مثلِ آب، جلد وہ ہے شکلِ باد
گرم خو مانندِ آتش ہے وہ کوہِ اعتدال
مدح گو اے لطفؔ بس تو اب دعائے کر بدل
کیوں کہ مدت سے اجابت کو ہے شوقِ اتصال
صفحۂ گیتی پہ جب تک مہر کو ہے مشقِ نور
اور جس دن تک ہے مہ کو لازمی شکلِ ہلال
نیرِ اقبال کو تیرے رہے عشقِ عروج
کوکبِ اعدا کو لازم ہو سدا اوجِ زوال
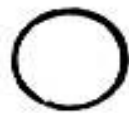
در تہنیت کیواں جاہ بہادر[1]

جب بخورِ عنبرِ عیش و صدائے عودِ جشن
مل کے دونوں نے بہم تا عرشِ اعظم راہ کی
چرخِ ہفتم پر ہوا کیواں ان کا عطر آگیں دماغ
فرطِ حیرت سے اشارت اُس نے سوئے ماہ کی
یعنی اے مسند نشینِ چرخِ اوّل دہر میں
محفلِ دنیا کی تو نے سیر خاطر خواہ کی

---

[1] مخطوطہ جرمنی میں عنوان دے کر قصیدہ لکھا گیا ہے۔

کہہ تو کس دولت سرا میں ہیں یہ بزم آرائیاں
رشکِ جنّت جس کی نکہت ہے ترے خرگاہ کی

ماہ نے سُن کر کہا اُس بزم کا کس سے ہو ذکر
ہاں مگر اتنا کہ وہ محفل ہے واہی واہ کی

میں بھی ہوں واں چاندنی کے تصویہ کا عہدہ دار
روشنی بھی ہے گی خدمت بندۂ درگاہ کی

کاخ سے تیری کمند اُس فیض کی اے بے خبر
سچ تو ہے بعدِ مسافت لی فقط کوتاہ کی

جس کی ہمنامی سے ہے تو چرخِ ہفتم پر امیر
آج ہے تقریب غافل اس کی بسم اللہ کی

یعنی کیواں جاہ جس کے طبعِ جوّاد و منیر
رکھتی ہے خورشید سیمائی دلِ آگاہ کی

بس کہ اُس کی طبع کا فطری فضائل پر ہے میل
ہے رذائل پر نگاہ اس خسر میں اکراہ کی

جودتِ ذہنی وذکا طبع اور حلم داد ب
جو عطا کی حق نے اس کو اس کے سب دلخواہ کی

کیوں نہ ایسا ہو سکندر طالع اس کو تربیت
ہے امیر اعظمِ دوراں ارسطو جاہ کی

وہ ارسطو جاہ جس کی وسعتِ ملکِ کرم
بیکِ وہم فلسفہ کو راہ ہے سال دماہ کی

بس کہ تسخیرِ دلِ عالم میں اُس کے ہے کمال
جس طرف دیکھو صدا ادھر ہے واادر واہ کی[1]
آج یہ قوت ضعیفوں کو ہے اُس کے عہد میں
کہربا آتا ہے بھر کے بل کشش سے کاہ کی
جس پیادے کو سمجھ کر حال کا فرزیں کیا
رخ کرے اس کی طرف پھر کیا ہے قدرت شاہ کی
جان و دل سے وہ زبس شیرِ خدا کا ہے غلام
شیر گردوں واں کرے ہے بازیاں روباہ کی
چشمِ بد دور آج جو زیب کمر ہے اُس کے تیغ
کوہ ہے جو رنگ اور شمشیر دشمن کاہ کی
رزم آرائی میں اُس کے کارناموں کے حضور
ہفت خوانِ رستم اک ہے جہملات افواہ کی
ہو معاذ اللہ مرض اس کی عداوت کا جسے
کب زمانہ اس کو پھر دیتا ہے فرصت آہ کی
دشمن بے آبرو ڈنک ہوئے گر آتش فرو ز
خاک کر دیوے ہوا ہے اس کو یاد افزاہ کی
لطف چل بہرِ دعا اس کی حضوری میں کہ یوں
ہوتی دل جمعی نہیں مداحِ دولت خواہ کی
اے وزیر اعظم فرماں دہِ ملک دکن
فیض ہے بے شک تجھے درگہ سے حضرت شاہ کی

---

[1] مخطوطہ گلشن ہند سالار جنگ میوزیم میں "جس طرف دیکھو صدا ادھر ہی واہ واہ کی" لکھا ہے

رشوتیں دے کرا جابت نے اجارہ سی کیا
جب دعا کی عالمِ بالا یہ بھی تنخواہ کی
بہرا سمائے جلیلِ قدر رحمٰن الرحیم
ہو مبارک تجھ کو بسم اللہ کیواں جاہ کی

در مدح ارسطو جاہ

کل معطر تھی صبا تک نکہتِ دلکش کے ساتھ
جس کے آگے بوئے گُل کو حکمِ نوکِ خار ہے

بے کلی کی دل نے فرطِ شوق سے ایسی کہ میں
بے تکلف بول اٹھا ظالم یہ بوئے یار ہے

سُن کے آشفتہ ہوئی مانندِ زلفِ مہوشاں
بو ہے تو مفتوں بوئے طرۂ طرار ہے

ترے آگے قدر رکھتی ہے شمیمِ زلفِ یار
یاں خجل مشکِ ختن اور نافۂ تاتار ہے

اُس کے گلزارِ طبیعت کی یہ بو ہے بے خبر
جس کی نکہت سے معطر عقل کا گلزار ہے
رشکِ افلاطون ارسطو جاہ جس کا باغِ طبع
رو کشِ فردوس محسودِ جمالِ یار ہے
بحر کی تشبیہ سے طبعِ رواں کو اس کی ننگ
عقل روشن اُس کی گو تمثیل خور سے عار ہے
سُن کے یہ مژدہ صبا سے ہو گیا دل باغ باغ
عقل بولی یہ ترے اقبال کا آثار ہے
لکھ غزل اک مدح میں اس معدنِ معنیٰ کی جلد
تو سخن کا ہے زرِ خالص تو وہ معیار ہے
مطلعِ خوش آب یہ جو سلکِ گوہر دے تو نذر
گر سخن سنجوں میں تجھ کو آبرو درکار ہے
تجھ سے دُرِ عقل کو یہ گرمیٔ بازار ہے
جا چھپا خجلت سے دریا میں دُرِ شہوار ہے ؎۱
مارے چشمک نہ محیطِ چرخ پر جس کا حباب
تیر بحرِ فکر وہ یک قلزم و ذخار ہے

؎۱ ۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے اس کو دوسرا قصیدہ لکھا ہے، حالانکہ یہاں سے اسی قصیدہ کا دوسرا مطلع شروع ہوتا ہے۔

ہے دبیر چرخ پیچ پیر فلک آگے تیرے
مثلِ اطفالِ غبی موہنہ کھوے جوں طومار ہے
علمِ طب کو اعتدالِ طبع میں تو لے جو تو
سو عِلل سے واں شفائے شیخ بھی بیمار ہے
گر طبعی کی طرف آوے طبیعت ٹک تیری
کچھ تجھے فضلِ الٰہی سے نہیں دشوار ہے
گذرے اثبات ہیولیٰ کا اگر دل میں خیال
صاف بھی ابطالِ جُزبے قدر و بے مقدار ہے
محفلِ صولت میں تیری آفتاب اور کہکشاں
ساغرِ گلگونِ مئے اور دست رعشہ دار ہے
واہ رے حلم اس حشم پر اے سلیماں احتشام
تجھ سے پہونچا مور کے دل کو نہیں آزار ہے
لائے بھی تیری شمیمِ خلق اس کو اس کی جا
سیر کی گر جا گہہ نافہ آہوئے تاتار ہے
صافیٔ طینت کو تیری کس سے دیں تشبیہ دوں
یاں صفائے آئینہ مستغرق زنگار ہے
راستیٔ طبعِ رنگیں کا تیری جس جا ہو ذکر
پُشتِ پا سے وہاں نہیں اُٹھتی نگاہِ یار ہے
اے وزیر اعظم شاہ سلیماں مکرمت
رونقِ نظمِ دکن تجھ سے پروے کار ہے

کہیے گو تجھ کو فلاطوں رتبہ اور آصف مقام
تو وزارت کے مراتب کی فقط تکرار ہے
اور اگر اصل و نسب کو سوچے عقلِ دوربیں
تو ترے بندوں کو بھی ان نسبتوں سے عار ہے
کیوں کہ گر کسریٰ نسب ہے رونقِ بزمِ کیاں
واں فلاطوں کو رسائی ہے تو وقتِ بار ہے
ہے تجھے شایاں اگر کہیے تجھے کیکاؤس فر
کیوں کہ کسریٰ عدل و دارا قدر و جم مقدار ہے
کر دعا پر ختم بس اے لطف ہے ترکِ ادب
اور اجابت کا بھی اب اس امر میں اصرار ہے
گلشنِ اقبال تیرا نت رہے با آب و رنگ
دہر کا شاداب و خرم جب تلک گلزار ہے

رُباعیاں
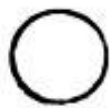
دن عید کے دیکھ تیری عالی شانی
چشمِ آئینہ ساں ہے منتظرِ حیرانی
تصویر ہے فی المثل اگر تیرا عدو
حیراں ہے برنگِ دیدۂ قربانی

○

نوبت نے جو مہ لقا کی با صد شوکت
زیرِ و بمِ آسماں سے چاہی رفعت
ناہید نے ہنس کے مُشتری سے یہ کہا
اب لیلیٰ و شیریں کی کہاں ہے نوبت
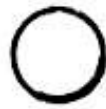
جنت سے کہے بزم مری بو دیکھو
یوں جام کہے جم سے کہ مجھ کو دیکھو
ہر آئینہ، آئینہ محل کا تیرے
کہتا ہے سکندر سے کہ منہ تو دیکھو

دے جس کو شرابِ ناب پانی کا مزا
کیا خاک ہے اس کو زندگانی کا مزا
اے جان جوانی وہ جواں مرگ مری
تجھ بن ہو ذرا جیسے جوانی کا مزا

منہ رکھتے ہیں کیا صاحب تاج و دیہیم
جو خاک نشینوں کے تئیں جانتے سیقیم
ہم آنکھ اٹھا دیکھیں نہ گردوں کی طرف
گر خم نہ ہو ماہِ نو برائے تعظیم

○

جو کوئی کہ آفتِ نہانی مانگے[1]
اور ملکِ عدم کی کچھ نشانی مانگے
دکھلا دے اُسے تو اپنی شمشیرِ نگاہ
جس کا مارا کبھی نہ پانی مانگے

○

---

[1] یہ رباعی "دیوانِ لطف" (قلمی) کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، "گلشنِ ہند" مخطوطہ سالار جنگ اور "گلشنِ ہند" مخطوطہ جرمنی میں موجود نہیں ہے جبکہ بعض مطبوعہ نسخوں اور تذکروں میں بھی اس کو شامل کیا گیا ہے مثلاً "عمدۂ منتخبہ" "مجموعہ نغز" "خوش معرکۂ زیبا" اور "تذکرۂ ہندی" میں یہ رباعی ملتی ہے۔

متفرق اشعار

سنائی تو ہمیں فرہاد نے تیشہ زنی اپنی
جو ہوتے کوہ کن تو ہم دکھاتے جاں کنی اپنی

○
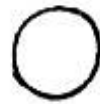
قیس کی جا اب ہماری خاطرِ ناشاد ہے[۵]
روحِ مجنوں شاد اقلیمِ جنوں آباد ہے

○
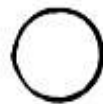
ہے دلِ ناداں ہوا نخچیر کس بے باک کا
ننگِ عنقا تنگ ہے جس کے حلقۂ فتراک کا

۵۔ ع اب جو ویرانہ میں رہتا یہ ترا ناشاد ہے۔ (عمدۂ منتخبہ ص ۵۵۱)

کھُل گیا اب یہ کہ وصل اس کا خیالِ خام ہے
آج امیدوں کا دل ہی دل میں قتل عام ہے[۱]

○

کونین سے اے لطف ابھی لیتے ہیں منہ موڑ
عارض پہ ہوں گر اس بُتِ مغرور کے عارض[۲]

○

اس سے کیوں چشم مروت تجھے اے یار نہیں
تیرے الطاف کا کیا لطف سزاوار نہیں[۳]

○

اگرچہ فرق زمیں آسماں کا ہے، تاہم
ملے ہے وضع فلک کی بہت تری خو سے[۴]

۱۔ "تذکرۂ ہندی" از مصحفی مرتبہ مولوی عبدالحق ۱۹۳۲ء ص ۲۰۱ اور "عمدۂ منتخبہ" از محمد خاں سرور ص ۵۵۲ "خوش معرکۂ زیبا" صفحہ ۱۷۵

۲۔ "گلستانِ بے خزاں" مولفہ میر قطب الدین باطن مطبع نول کشور ۱۸۷۵ء ص ۲۰۲

۳۔ "خوش معرکۂ زیبا" مولفہ سعادت خاں ناصر مرتبہ شمیم انہونوی لکھنو، ۱۹۷۱ء ص ۳۶۔

۴۔ "تذکرۂ طور کلیم" مولفہ سید نورالحسن خاں ۱۲۹۸ھ ص ۸۷

واقف رموزِ ملک سے ہیں شاہ و شہریار
ہے تو گدائے گوشہ نشیں لطف کچھ نہ بول[۱]

○

بیگانوں نے کبھی نہ وہ کانوں سنائی بات
افسوس آشنا نے جو آنکھوں دکھائی بات

○

کل ہی مقدور نہ تھا درد سے دم لینے کا
لطف پھر آج تیرا قصد ہے دل لینے کا

لہ۔ "گلشن ہند" مولفہ مرزا علی لطف مرتبہ شبلی نعمانی ۱۹۰۶ء لاہور ص ۶۷ پر یہ شعر لطف نے اپنے تذکرہ میں ابوالحسن تاناشاہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے جو دراصل حافظ کے مندرجہ ذیل شعر کا ترجمہ ہے ؎

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی، تو حافظا مخروش

یہ شعر "گلشن ہند" مخزونہ جرمنی ص ۴۲ (ب) پر فرد کی سرخی کے تحت لکھا گیا ہے اور "گلشن ہند" مخطوطہ سالار جنگ میں تاناشاہ کے بیان میں صفحہ نمبر ۵۵ (ا) پر موجود ہے۔

○

آج کیا جانے وہ کیوں آرامِ جاں آیا نہیں
حرفِ رنجش کل تو کوئی درمیاں آیا نہیں

○
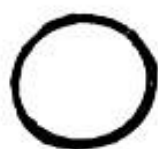
جوں عمرِ خضر زیست کو میری نہیں زوال
میں مرگیا ہوں دیکھ کے جاناں کے لمبے بال

○

ابطال = باطل کرنا، جھوٹا کرنا۔

ابوذر = ابوذر غفاری، ایک صحابی کا نام

اجابت = منظوری، قبول کرنا۔

اچپل = شوخ، چنچل۔

اختلال = خلل میں پڑنا، مخل ہونا۔

ادیم = چمڑا، سطح زمین۔

اذفر = خالص مشک۔

اطوال = بہت طویل، بہت لمبا۔

اعتذار = عذر کرنا، عذر خواہی۔

اِستاد = خیمہ یا شامیانے کی چوب، خیمہ کا کھڑا ہونا۔

اکراہ = نفرت، ناخوشی۔

امل = امید، خواہش۔

انگلن = انگلستان

بحار = بحر کی جمع، سمندر۔

بُخور = عود، لوبان۔

بدسگال = بدخواہ۔

بسان = مانند۔

بسو = گھڑا، مٹکا۔

بکتری = زرہ، بکتر سے لیس۔

بہوت = بہت۔

پنبہ = کپاس، روئی۔

پُنوانا = کوسنا، لعن طعن کرنا۔

پھنسوا بیٹھے = پھنسا بیٹھے

پیچش کرنا = پیچ کھانا۔

پیل = ہاتھی

تبار = خاندان، اولاد

تتار = تاتار کا مخفف،
ترکستان کا شہر۔

تضویہ = پھیلانا۔

تضویر (تذویر) = دھوکہ، فریب

تضعیف = دوگنا کرنا،
زیادہ کرنا۔

توسن = گھوڑا

تیں = لیئے

ٹک = ذرا

جاگہ = جگہ

جبال = پہاڑ (جبل کی جمع)

جم = ہمیشہ

جم = جمشید کا مخفف

جوشن = زرہ، بازو کا ایک زیور

حسود = حسد کرنے والا، بدخواہ

خار (خوار) = ذلیل، برا

خجل = شرمندہ

خدنگ = تیر، ایک مضبوط
درخت کا نام۔

خرس = ریچھ، بھالو

خشونت = سختی، درشتی

خلطا = صحبت، شرکت

خمول = گمنامی

خیار = اختیار کرنا، قبول کرنا،
بموجب شرع

دستخطی = ہاتھ کا لکھا ہوا۔

دلق = گدڑی، فقیروں کا لباس

دلق ملمع = ظاہرداری کا لبادہ

دوال = چمڑے کا تسمہ

دون = غیر، تھوڑا

دیہیم = تاج شاہی

رکھائی = بے التفاتی، روکھاپن

رگ زن = جراح، رگ کھولنے والا

زاغ = کوا

زغن = چیل

زال = بوڑھا، رستم کے باپ کا نام

زلال = شیریں اور صاف پانی

زمزمہ = ترنم، ترانہ
زنگاری = سبز، ہرا
زنبور = شہد کی مکھی۔
زینہار = ہرگز، کبھی نہیں۔
ساں = سا، مانند
سانٹھ = گرہ، عداوت
سبزہ رنگ = سانولا
سد = اوٹ، دیوار
سرشک = آنسو
سقف = چھت۔ شامیانہ
سم = آواز، تال
سمندر = ایک کیڑا جو آگ میں رہتا ہے۔
سقیم = عیب دار، ناقص
شحنہ = محافظ شہر، کوتوال
شغال = گیدڑ
شپّر = چمگادڑ
شیون = غم، سوگ
صواب = درستی، راستی
صنادید = سردار، بادشاہ
صولت = رعب، ہیبت

صیدگاہ = شکار کھیلنے کی جگہ، شکارگاہ
طامع = حریص، لالچی
طبل = نقارہ
طوطیا (توتیا) = زہر
غربدہ جو = جنگجو، معشوق
غبغب = تھوڑی کے نیچے کا لٹکا ہوا گوشت
غرا = سریش، چپکنے والی چیز
غر = بھاگنے والا۔
فراخور = لائق، مناسب
فرزیں = شطرنج کے کھیل میں وزیر کا مہرہ، عاقل۔
قتال = جنگ، لڑائی
قیر = تارکول
قنبر = حضرت علیؑ کے غلام کا نام
کاہ = کٹی ہوئی سوکھی گھاس
کبھو = کبھی، گاہے، کسی وقت
کتان = ایک قسم کا باریک کپڑا جس کی نسبت مشہور ہے کہ چاندنی رات میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔
کدو = کوزۂ شراب، شراب کی صراحی

کر = شان وشوکت، زور، طاقت

کساد = عدم خریداری، اشیا، جنس کا نہ بکنا۔

کفک = مہندی لگا ہوا پیر کا تلوا یا ہتیلی۔

کنجشک = ایک مشہور پرندے کا نام

کور = اندھا، نابینا

کوس = نقارۂ کلاں

کہربا = ایک قسم کا گوند جس کو کپڑے یا چمڑے پر رگڑ کر گھاس کے تنکے کے سامنے رکھیں تو وہ اسے اٹھا لیتا ہے۔

کھڑکا = آہٹ

کیدھر = کدھر

کیکاوس = ایران کے ایک بادشاہ کا نام

کیونکہ = کیوں نا

گبرو = نوجوان

گرک = بھیڑیا

گوشمالی = سزا، تنبیہ

لاکھا = لاکھ کا سرخ رنگ، ہونٹوں کو لگانے کی سرخی

لال = گونگا، بہرہ۔

لکہ = ابر کا ٹکڑا

مامن = پناہ گاہ، آرام کی جگہ

مائدہ = چنا ہوا دسترخوان

مُخ = مسیرا، میری

محک = کسوٹی۔

مخمر = گوندھا ہوا۔ خمیر کیا ہوا۔

مردمک = آنکھوں کی پتلی۔

مردہ شو = غسال

مستاصل = جڑ سے اکھاڑنے والا۔

مُشبک = جالی دار، جس میں سوراخ ہوں۔

مُشہد = شہیدوں کا قبرستان

مضغہ = گوشت کا لوتھڑا۔

معدلت = عدل وانصاف

مغفری = وہ جو خول پہنا ہوا ہو۔

مفروش = بچھایا ہوا۔

مقال = بات، گفتگو

مُقر = اقرار کرنے والا، معترف

مَقر = زہر

مکحول = سُرمہ لگا یا ہوا۔

مکنوں = پوشیدہ

منقار = چونچ

مو = بال،

ناروَن = انار کا درخت

نبیڑنا = پورا کرنا، ختم کرنا۔

نت = ہمیشہ

نرد = شطرنج کا مہرہ، چوسر کی گوٹ

نمط = مانند۔

نہور = خوشامد، منت۔

نہیب = خوف، ہیبت۔

واشگوں = اوندھا۔ اُلٹا

وقر = عزت، بھاری بھرکم پن

وے = لیکن، مگر

ووہیں = ویسے ہی، ساتھ ہی

ہاجی = ہجو کرنے والا۔

ہیں گے = رہیں گے۔

یم = سمندر

یمین = برکت والا۔

"مرزا علی لطف، حیات اور کارنامے" کے بارے میں چند مشاہیر کے تاثرات

مرزا علی لطف دورِ فورٹ ولیم کالج کی ان ادبی شخصیات میں سے ہیں جن پر اب تک پوری توجہ نہیں کی گئی تھی۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ شعرائے اردو کے اولین تذکرے کی حیثیت سے گلشنِ ہند کی اہمیت مسلّم ہے۔ لیکن اب تک اس تذکرے کے جتنے متن سامنے آئے ہیں وہ ہر لحاظ سے مکمل نہیں تھے۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے ان پر تحقیقی و تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان حصوں کی نشاندہی کی ہے جو اب تک منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔ پہلی اشاعتوں میں گلشنِ ہند کے کچھ حصے حذف کر دئے گئے تھے اور نمونۂ کلام میں بھی تحریف کر دی گئی تھی۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے تمام نسخوں کا موازنہ کر کے اس بارے میں نہایت اہم معلومات فراہم کر دی ہیں۔ اس مقالے کے ذریعہ مرزا علی لطف کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی سامنے آیا ہے۔ وہ ہے ان کی تخلیقی حیثیت۔ مصنف نے مرزا علی لطف کا دیوان عثمانیہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں کھوج نکالا ہے۔ اب تک دیوانِ لطف کا صرف ایک ہی نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ بالعموم لطف کی شعری شخصیت کی تصویر مختلف تذکروں میں حوالے کے طور پر دئے گئے ان کے چند اشعار کی مدد سے مرتب کی جاتی تھی۔ اس دیوان سے پہلی بار معلوم ہوتا ہے کہ لطف کی بنیادی حیثیت شاعر ہی کی ہے اور ان کا ذہن تخلیقی صلاحیت سے مالا مال تھا۔ انہوں نے قصیدے بھی لکھے، مثنوی اور رباعیاں بھی، اور غزلوں کا بھی وقیع ذخیرہ دیوان میں موجود ہے۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اس سارے شعری سرمایے پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور لطف کی خوش گوئی اور سخن آفرینی کی تحسین و قدر کی ہے۔

مقالے کے آغاز میں لطف کی سوانحی کڑیاں ملائی گئی ہیں اور ان کی شخصیت کو مربوط طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے ہر جگہ تلاش و جستجو سے کام لیا ہے اور اپنی معلومات کو سلیقے سے پیش کیا ہے۔ اگر ہماری تحقیق نسبتاً غیر معروف ادبی شخصیتوں پر اس طرح توجہ صرف کرے تو ادبی تاریخ کی بہت سی گم شدہ کڑیاں ملائی جا سکتی ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ
صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی
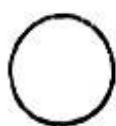
اُردو تحقیق کے میدان میں جامعہ عثمانیہ ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ جامعہ کے معلمین اور متعلمین نے اُردو ادب میں عہد آفریں کارنامے پیش کر کے تحقیق کی بڑی جاندار اور شاندار روایات قائم کی ہیں۔ "مرزا علی لطف - حیات اور کارنامے" کے مصنف ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنی تحقیق میں اس روایت کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے مرزا علی لطف کی حیات اور کارناموں [illegible] اُن کے اہم اور مشہور تذکرے "گلشنِ ہند" پر ناقدانہ اور محققانہ نظر ڈالی ہے۔ "گلشنِ ہند" [illegible] یوں تو شبلی نعمانی، ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر زور جیسے بلند پایہ محققین کروا چکے تھے لیکن اُن کے بہت سے گوشے پردہ خفا میں تھے۔ ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے ہند اور بیرونِ ہند کے کتب خانوں سے نایاب و نادر مواد اکٹھا کر کے محققینِ اُردو کے سامنے ایک نیا باب کھولا ہے۔

نوجوان مصنف ایک برگزیدہ اور علم دوست خاندان کے نام لیوا ہیں اُن کے بزرگوں نے اُردو ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ مرزا علی لطف کی حیات اور کارناموں کے ذریعے اُردو تحقیق کے وسیع میدان میں ایک جانباز، ذہین سپاہی کا داخلہ ہو رہا ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد "مشک آنست کہ خود ببوید" کے مصداق اس کا اندازہ خود قارئین کو ہوگا۔

پروفیسر رفیعہ سلطانہ

ڈین فیکلٹی آف آرٹس عثمانیہ یونیورسٹی

حیدرآباد، اے پی

○

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کے حالات کی چھان بین میں تحقیق کا حق ادا کیا ہے انہوں نے تمام قابلِ حصول ماخذوں کو ٹٹولا ہے مدلل بحثیں کی ہیں، مختلف بیانات کی تنقیح کی ہے اور اصابت رائے کے ساتھ نتائج اخذ کیے ہیں اسی طرح انہوں نے ایک طرف "گلزار ابراہیم" اور "گلشن ہند" کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور دوسری طرف پیش رو تذکروں سے "گلشن ہند" کا موازنہ کر کے شعرائے اردو کے تذکروں میں گلشن ہند کے مقام اور مرتبہ کا تعین کیا ہے اکبر صاحب شگفتہ اور رواں زبان لکھتے ہیں۔ انداز بیان محتاط اور وقیع ہے جس میں علمی شان جھلکتی ہے

مجھے توقع ہے کہ ان کی ادبی اور تحقیقی کاوشیں جاری رہیں گی اور آنے والے دنوں میں، اُردو زبان وادب کی دنیا میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں گے ۔

ڈاکٹر غلام عمر خاں
پروفیسر اردو، عثمانیہ یونیورسٹی
حیدرآباد

سمن زار ۔ اکبر باغ
حیدرآباد دکن

○

آپ نے "مرزا علی لطف حیات اور کارنامے" مرتب کر کے اُردو تنقیدی ادب میں ایک گراں بہا اضافہ فرمایا ہے میں آپ کی محنت کی داد دل کی گہرائیوں سے دیتا ہوں۔ اُردو تذکرہ نگاری میں لطف کا نام ہمیشہ غیر معمولی اہمیت کے ساتھ لیا جائے گا لطف ہی پہلے تذکرہ نویس تھے جنھوں نے اردو نثر میں تذکرہ نویسی کی داغ بیل ڈالی تھی اس طرح ان کی نثر کی اور بھی زیادہ اہمیت ہے۔ آپ نے اس تذکرے کی جامعیت بیان کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ امید ہے کہ تحقیقی کاموں کے سلسلے میں یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔

(ڈاکٹر) اکبر حیدری کاشمیری
ریڈر اُردو کشمیر یونیورسٹی

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے کے لئے مرزا علی لطف کی شخصیت اور تصانیف کو منتخب کیا ہے۔ انہوں نے تمام معلوم مصادر کے علاوہ بعض ایسے ماخذ سے بھی استفادہ کیا ہے جن کا ابھی تک پورا استعمال نہیں ہوا تھا۔

فاضل مقالہ نگار نے بہت محنت اور سلیقے کے ساتھ یہ تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے اس کی اشاعت سے نہ صرف مرزا علی لطف کی زندگی اور تصانیف کے بارے میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہو رہا ہے بلکہ عہدِ متوسطین کی ادبی تاریخ کی ایک اہم کڑی ہمیں دستیاب ہو جاتی ہے۔

دانش گاہوں کے بہت سے تحقیقی مقالے عموماً سطحی ہوتے ہیں اور چھپوانے سے زیادہ چھپانے کے مستحق ہوتے ہیں ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ کی یہ علمی کاوش یقیناً قابل قدر اور لائق مبارک باد ہے۔

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

ریڈر عربی، فیکلٹی آف آرٹس

دلی یونیورسٹی ۔ دہلی

مرزا اکبر علی بیگ کی یہ پہلی علمی اور تحقیقی کاوش ہے جہاں تک مواد کی فراہمی کا تعلق ہے انہوں نے بساط بھر تلاش و جستجو سے کام لیا اور جو معلومات حاصل ہوئیں ضروری تفتیش کے بعد اُن سے کارآمد نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی اور مستحکم دلائل کے ساتھ انھیں اپنے مقالے میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے مقالے میں چند ایسے گوشے ابھارے ہیں جو اہل تحقیق کو دعوت فکر و نظر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر مغنی تبسم

ریڈر اردو، عثمانیہ یونیورسٹی

حیدرآباد، اے پی

میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے اپنی قابلِ قدر کتاب "مرزا علی لطف" ارسال فرمائی۔ مجھے اس سے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے ایک ایسی شخصیت پر مقالہ لکھا اور کتابی صورت میں شائع کیا، جس کے نام سے نئی نسل تو خیر کیا واقف ہوگی، ہماری پشت کے لوگ بھی جنھیں تحقیق کا چسکا نہیں، یا اس نوع کے اسلاف کے متعلق جاننے کی کوشش نہیں کرتے لطف کے نام تک سے ناآشنا ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے نہایت خلوص کے ساتھ موضوع کا انتخاب کیا ہوگا اور مواد کی تلاش میں بھی آپ کو مشکل پیش آئی ہوگی آپ نے نہ ہمت ہاری ہوگی اور نہ مایوس ہوئے ہوں گے۔ میں آپ کی کاوش اور ہمت کی دل سے داد دیتا ہوں۔ میں اس کتاب کو ادب کا قیمتی سرمایہ سمجھتا ہوں۔

مرزا ظفر الحسن
ادارہ یادگارِ غالب
ناظم آباد، کراچی۔ ۱۸، پاکستان

نام : مرزا اکبر علی بیگ

والد کا نام : جناب مرزا غضنفر علی بیگ صاحب مرحوم

پیدائش : ۴ ستمبر ۱۹۴۴ء حیدرآباد آندھرا پردیش

تعلیم : ایم اے، پی ایچ ڈی (عثمانیہ)

ملازمت : لیکچرر، شعبۂ اردو،
عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

سکونت : ۲/۲-۱۰۳۲-۹-۵، حیدرگوڑہ
حیدرآباد-۵۰۰۰۰۱

تصانیف :

۱. مرزا علی لطف حیات اور کارنامے ۱۹۷۹ء
۲. دیوان لطف اپریل ۱۹۸۳ء
۳. خوش نفساں اکتوبر ۱۹۸۲ء
۴. محمد عزیز مرزا شخصیت، حیات اور کارنامے زیر طبع
۵. تذکرہ گلشن ہند (مؤلفہ مرزا علی لطف) زیر طبع
۶. نفوس گرامی (سوانحی خاکے) زیر طبع
۷. نور (ادبی تبصرے) زیر طبع
۸. نقطۂ نگاہ (تنقیدی مضامین) زیر طبع
۹. مکاتیب عزیز (محمد عزیز مرزا کے خطوط) زیر طبع